اضافہ شدہ جدید ایڈیشن
معارف الرحیم
تدریسِ قرآنِ کریم
کے راہنما اصول
بیان فرمودہ
اُستاذُ الاساتذہ، رئیسُ القُراء، عاشقِ قرآن
حضرت مولانا قاری محمد یسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ
مدیرِ اعلیٰ: جامعہ دارالقران و جامعہ ضیاء القران فیصل آباد
ترتیب و تدوین
ڈاکٹر مفتی محمد حسین
مولانا ڈاکٹر عمر فاروق راشد

نام کتاب..........................تدریس قرآن کے رہنما اصول

فرمودات..........................حضرت مولانا قاری محمد یاسین، فیصل آباد

ترتیب وتدوین..........................ڈاکٹر مفتی محمد حسین، ڈاکٹر مفتی محمد عمر فاروق راشد

رابطۂ مرتب، کال/واٹس ایپ..........................0300-3369748

ناشر..........................ادارہ معارف الفتح والرحیم، فیصل آباد

☆☆☆

اشاعت اوّل..........................مارچ 2013ء

اشاعت دوم..........................مارچ 2014ء

اشاعت سوم..........................مارچ 2015ء

اشاعت چہارم..........................مارچ 2016ء

اشاعت پنجم (نظر ثانی، ترتیب نو اور کثیر اضافات کے ساتھ)..........نومبر 2023ء

☆☆☆

ملنے کے پتے

فیصل آباد:......مکتبہ عثمان غنی، جامعہ دار القرآن، مسلم ٹاؤن (0300-7203324)

فیصل آباد:......قاری محمد ارشد، دفتر: جامعہ ضیاء القرآن، باغ والی مسجد ماڈل ٹاؤن، سی

(0313-7061617;0345-7771176)

لاہور:......قاری مطیع الرحمٰن (0300-8096629)

کراچی:......قاری عبد المجید، مدرسہ روضۃ القرآن، عزیز آباد۔۲ (0300-7007075)

ملتان، بہاولپور:......قاری محمد عمران (0301-6069682)

گوجرانوالہ:......حافظ حسن معاویہ (0301-8320750)

بسم الله الرحمن الرحيم

فرمایا:

”جب کوئی بچہ مجھے سبق نہیں سناتا... میرے گلے سے لقمہ نیچے نہیں اترتا... میرا خیال ہر وقت اسی طرف لگا رہتا ہے... رات کو بستر پر لیٹے لیٹے سوچتا رہتا ہوں... آج اس بچے نے سبق کیوں نہیں سنایا؟... اس کی وجہ کیا ہے؟... میں اس کے اسباب میں غور کرنے لگتا ہوں... یہ خیال مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے... کہیں ایسا میری اپنی غفلت کی وجہ سے تو نہیں ہوا... سوچتا ہوں... وہ بچہ ہی کند ذہن ہے یا پھر اس کی طرف مجھے جیسی توجہ کرنی چاہیے تھی، ویسی توجہ میں نہیں کرسکا۔“

(مجدِّدُالقراآت حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

تقریظات

سابق صدر وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ القراء، حضرت اقدس

ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی صاحب دامت برکاتہم

رکن: قرآن بورڈ، حکومت پنجاب

ترتیب

آئینہ مضامین

کچھ صاحب کتاب کے بارے میں

پہلا باب: تمہیدی گزارشات؛ایک مثالی مدرّس قرآن

دوسرا باب: کامیاب مدرّس قرآن کے اوصاف

تیسرا باب: چند قابلِ اصلاح امور

چوتھا باب: تحفیظِ قرآن کے راہنما اصول
(ابتدائی قاعدے سے فارغ التحصیل ہونے تک)

پانچواں باب: تدریسی مشکلات اور ان کا حل

چھٹا باب: اساتذۂ فن کے سبق آموز واقعات

ساتواں باب: تربیتِ طلبہ کے رہنما اصول

ضمیمہ جات

ضمیمہ (1): تربیتی مذاکرے

ضمیمہ (2): حضرت قاری صاحب کے انٹرویوز

☆☆☆

پیش لفظ

(حضرت اقدس حضرت مولانا قاری محمد یاسین صاحب مدظلہم العالی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلّما. أما بعد:

زیرِ نظر کتاب "تدریسِ قرآن کے رہنما اصول" اس ناکارہ کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے اور نہ ہی میں تصنیف و تالیف کے میدان کا کوئی فرد ہوں۔

میرے پیارے عزیز مولانا مفتی حافظ محمد حسین صاحب سلمہ (جن کو میں اب بھی پیارے یا حسین! کہتا ہوں) نے میرے پاس قرآن پاک حفظ کیا۔ حفظ کے بعد میرے ہی زیرِ نگرانی جامعہ دارالقرآن فیصل آباد میں درجہ سادسہ تک کتب پڑھیں۔ اس کے بعد مشکوٰۃ و دورہ حدیث دارالعلوم کراچی میں کیا۔ تخصص فی الفقہ بنوری ٹاؤن میں کیا۔ ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔ ماشاء اللہ! ہونہار اور صالح نوجوان ہیں۔

انہوں نے مجھ سے اجازت طلب کی کہ تعلیم و تدریسِ حفظ قرآن پاک کے بارے میں جو ہم نے آپ سے سیکھا ہے یا وقتاً فوقتاً اس موضوع پر بعض مجالس میں آپ سے ہم نے سنا ہے، ان کو جمع کر کے آپ کے سامنے پیش کروں اور افادۂ عام کے لیے اس کو شائع کروں۔

انہوں نے ماشاء اللہ! محنت کر کے مختلف جگہ سے مواد جمع کر کے اسے ایک کتاب کی شکل دے دی ہے۔ ترتیب و تدوین مکمل ہونے کے بعد میں نے پوری کتاب کو حرف بحرف پڑھا ہے اور حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔

مجھے تو کبھی خیال بھی نہ آیا کہ میری ان غیر اہم اور غیر مربوط باتوں سے کسی کو تدریسی فائدہ پہنچے گا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ مردہ سے زندہ کو پیدا کر سکتے ہیں تو اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ ان جمع شدہ چند باتوں سے کسی کو فائدہ پہنچادیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ محض حق تعالیٰ شانہٗ کا خصوصی فضل و کرم اور اپنے شیخ و مربی مقرئ اعظم اور حفظِ قرآن کی دنیا کے محسن اعظم حضرت مولانا قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کا فیض اور خصوصی دعاؤں، توجہات اور شفقتوں کا ثمرہ ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہٗ عزیزم موصوف اور ان کے برادر خورد جناب مولانا عمر فاروق راشد صاحب کو... جو ایک بہترین کالم نگار بھی ہیں اور اس کتاب کو ترتیب دینے میں ان کے معاون رہے ہیں... دارین میں اپنی شان عالی کے مطابق جزائے خیر عطا فرمائیں۔ ان دونوں حضرات کی کاوش کو قبول فرمائیں۔ اس کتاب کو قبولیت عامہ اور نافعیت تامہ نصیب فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ و سلم تسلیماً کثیرا

بیش قیمت تحفہ

رئیس المحدثین، شیخ المشائخ، صدر وفاق المدارس العربیہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب،
رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ و کفٰی و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، و بعد:

"تدریس قرآن کے رہنما اصول"، حضرت اقدس مولانا قاری محمد یاسین مدظلہم کے بیان فرمودہ پر آپ نے تقریظ لکھنے کے لیے فرمایا ہے، احقر کسی بھی حیثیت سے اس کا ہرگز اہل نہیں۔

کتاب پہنچ گئی۔ اس کو پڑھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس کے اربابِ اہتمام، اساتذہ، خاص طور پر قرآن مجید کے مدرسین اور طلبہ کے لیے یہ بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس کی قدر ہونی چاہیے۔ کتاب پڑھ کر حضرت مولانا قاری محمد یاسین کی شخصیت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں جامعیت نمایاں ہے۔ وہ قرآن مجید کے عاشقِ صادق، عالم، صوفی، دین اسلام کے قابلِ رشک خادم، مدبر، موفق من اللہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے فیوض کو خوب خوب عام تام فرمائیں، آمین ثم آمین۔

سلیم اللہ خان

جامعہ فاروقیہ، کراچی

۶/جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ 7/اپریل 2014ء

کام کے مدرس بنانے والی کتاب

شیخ الحدیث، سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، استاذ الاساتذہ
حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

قرآن کریم اور اس کے حاملین کے افضل ہونے میں شک وشبہ کی کیا گنجائش ہے؟ مگر چور (شیطان) وہیں شب خون مارتا ہے، جہاں مال (علم وفضل) ہو۔ حدیث شریف میں لوگوں کے نکمے ہونے کا یوں بیان ہے: "تجدون الناس کابل مائة لا یجد الرجل فیھا راحلة"...... "لوگوں کو سو اونٹوں کی طرح پاؤ گے جن میں سواری کے قابل ایک بھی نہ ہو۔" (صحیح مسلم) اس قحط الرجال کے دور میں یہ بات عموماً سامنے آتی ہے کہ درجۂ تحفیظ میں کام کا مدرس نہیں ملتا۔

کتاب ہذا میں حضرت مولانا محمد یسین صاحب دامت برکاتہم کے ناصحانہ تجربہ شدہ فرمودات کی روشنی میں کام کے مدرس بنانے کی بھرپور اور قابل قدر کاوش کی گئی ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ درجہ تحفیظ کے قراء صاحبان اگر بزرگ اساتذہ کے تجربات وہدایات سے فائدہ اٹھائیں گے تو اچھے اور معیاری استاذ بنیں گے۔ عنداللہ وعند الناس مقبول ہوں گے اور پھر ان سے پڑھنے والے شاگرد بھی ان کے نقش قدم پر چل کر ایسے ہی بنیں گے۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ قراء، مدرسین کو کتاب ہذا سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔ مرتب مفتی صاحب زیدمجدہ کے لیے اور ان کے اساتذہ کرام کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے، آمین۔

نہایت مفید مجموعہ

استاذ القراء، حضرت مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی صاحب، دامت برکاتہم
نائب مدیر و رئیس: شعبہ قراآت، جامعہ دار العلوم الاسلامیہ، لاہور

الحمد للّٰہ وحدہ، والصلوۃ و السلام علی من لا نبی بعدہ، و صلی اللہ علیہ و علی الہ و اصحابہ و اتباعہ اجمعین، و بعد:

کتاب ''تدریسِ قرآن کے رہنما اصول'' کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا اور الحمد للہ کتاب کو نہایت مفید پایا۔

حضرت قاری محمد یاسین صاحب مدظلہ العالی اسلاف کی نشانی ہیں۔ ان کے اقوال میں بزرگوں کا رنگ نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عامہ عطا فرمائے، آمین۔

احمد میاں تھانوی

3/ فروری 2015ء

دیباچہ

ایک مصدقہ کتاب

حضرت مولانا قاری عزیز الرحمٰن رحیمی
شیخ الحدیث جامعہ دار القرآن، فیصل آباد

الحمد لله رب العالمين و الصلوة و السلام على سيد الرسل و افضل الانبياء المرسلين، سيد نا و حبيبنا محمد و آله و صحبه اجمعين الى يوم الدين.

حضرت اقدس، سیدی وسندی، ماوائی وملجائی، والد گرامی قدر دامت برکاتہم العالیہ اور حضرت والدہ صاحبہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو قبول عام نصیب فرما کر، قرآن کریم کی عظیم خدمت کے لیے وقف فرمایا، بلاشبہ یہ ان کی زندگی کی عملاً ایک کرامت محسوس ہوتی ہے۔

حضرات والدین کریمین نے اپنی جوانی اور بڑھاپے کا صبح وشام، دن رات...... ہر موسم اور حالات میں جس جانفشانی، محنت، لگن اور تقویٰ وطہارت کی جس معراج کے ساتھ، خدمت قرآن کے لیے وقف فرمایا، اس کی مثال اس زمانہ میں ناممکن تو نہیں، البتہ مشکل ضرور ہے۔

بلاشبہ اس وقت پورے پاکستان میں سب سے زیادہ ''فیض قرآنی'' دریائے یاسین و فاطمہ سے پھیل رہا ہے۔ حضرت ابا جان کی تربیت سے مدرسین قرآن کی ایسی جماعت تیار ہوئی، جس نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلاف کی روایات کو زندہ کر دیا۔

حضرت ابا جان دامت برکاتہم بہت طویل اور گہری خاموشی رکھنے والی ہستی ہیں۔ اب

تک اپنی پوری شعوری زندگی میں ان کی زبان مبارک سے کسی مسلمان کی غیبت نہیں سنی۔ خلوت وجلوت میں ان کی زبان کو انتہائی محتاط دیکھا ہے۔ قاعدہ کی تعلیم سے لے کر دورہ حدیث شریف کے تمام اساتذہ کا جس قلبی گہرائی سے ادب فرماتے ہیں وہ بھی قابل دید اور قابل داد منظر ہوتا ہے۔

وہ اپنے استاد اور شیخ، بندہ کے جد امجد، اسوۃ الصالحین مقری اعظم، سیدی، قبلہ، مجدد القرآت حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ (فاضل دارالعلوم دیوبند، شاگرد رشید شیخ الاسلام سیدنا حسین احمد مدنی وشاطبی وقت، جزری عصر حضرت قاری فتح محمد رحمہ اللہ پانی پتی) کے ساتھ جس محبت وفنائیت والی خدمت کا وقت گزارا، بلاشبہ ان کی نسبت اتحادی اور نسبت فیض اپنے عظیم داماد اور عظیم صاحبزادی میں منتقل ہوگئی۔

حضرت اباجان دامت برکاتہم کا مزاج، وعظ و بیان سے کوسوں دور ہے، تاہم اپنے شاگردوں اور منسوبین سے غیر رسمی گفتگو فرماتے رہتے ہیں۔ جو خصوصاً مدرسین قرآن اور عموماً تمام ہی خدام دین کے لیے موثر ہوتی ہے۔

حضرت اباجان کے لائق اور ہونہار شاگرد مخدوم ومکرم حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی محمد حسین (اسسٹنٹ پروفیسر، علوم اسلامیہ) اور مخدوم ومحترم حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی محمد عمر فاروق راشد (اسسٹنٹ پروفیسر، علوم اسلامیہ) نے بہت محنت کے ساتھ حضرت اباجان دامت برکاتہم کے فیوض کو جمع فرمایا۔ یقیناً اس مجموعے کا ہر ہر لفظ، قرآنی تاثیر سے منور اور مؤثر ہے۔

اب تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بہت سے مدارس میں اس کتاب کو مدرسین کی مجالس میں بالاستیعاب پڑھایا گیا۔

یہ پانچواں ایڈیشن بہت سارے مفید اضافات کے ساتھ (جس میں خاص طور پر بھولا ہوا حفظ دوبارہ یاد کرنا اور بنات کی تدریس وتحفیظ کی راہنمائی شامل ہے)، اور قبلہ والد محترم مدظلہ کی مکمل نظر ثانی کے بعد، زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تربیت معلمین کے لیے یہ ایک طرح کا مکمل نصاب ہے۔حق تعالیٰ یہ صدقہ جاریہ قبول فرمائے۔اس کا فیضان چار دانگ عالم میں پہنچائے اور حضرت ابا جان دامت برکاتہم کا سایہ اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ تا دیر قائم ودائم رکھے۔آمین ثم آمین۔

(اس کتاب کا حق اشاعت بھی،حضرت ابا جان نے،انہی عزیزان کے سپرد فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو علم نافع اور جزائے خیر عطا فرمائے۔)

بندہ عزیز الرحمٰن رحیمی
خادم الحدیث النبوی الشریف، جامعہ دار القرآن، فیصل آباد
معاون ناظم: وفاق المدارس العربیہ، پنجاب

مقدمہ

رودادِ سخن

استادِ محترم حضرتِ اَقدس، حضرت مولانا قاری محمد یاسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے اللہ تعالیٰ نے جو قرآن کریم کی خدمت لی ہے اور لے رہے ہیں، یہ حضرت پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور احسان ہے۔ ایسی توفیق اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں میں سے مخصوص بندوں کو ہی عطا فرماتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی پر محیط آپ کی خدمتِ قرآن کا اثر ہے کہ پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں اور بیرون ملک کئی شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں آپ کے براہِ راست شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد قرآن پاک کی تدریس میں مشغول ہیں۔ بحمداللہ! دنیا کے کونے کونے میں حضرت کی خدمتِ قرآن کا فیض پہنچ رہا ہے۔

اس وقت جو کتاب "تدریسِ قرآن کے رہنما اصول" آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ حضرت کے اُن بیانات پر مبنی ہے، جو حضرت نے قرآن پاک پڑھانے والے مدرسین، مکاتب قرآنیہ چلانے والے منتظمین واہل مدارس کے سامنے موقع بہ موقع ارشاد فرمائے۔ مواد کو ضبط و ترتیب سے گزار کر کتابی ترتیب میں ڈھالا گیا۔ کتاب میں شامل آیات مبارکہ، احادیث طیبہ اور واقعات کی تخریج کی گئی۔ کتاب کی تکمیل کے بعد حضرت دامت برکاتہم نے متعدد بار اسے لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرما کر تصحیح و ترمیم فرمائی۔ الحمدللہ! اپنی مقدور بھر محنت اور حضرت دامت برکاتہم کی تصدیق و دعاؤں کے ساتھ یہ قیمتی مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

امید ہے اس میں مذکور حضرت دامت برکاتہم کی ہدایات اور حضرت بڑے قاری صاحب (حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب پانی پتی) کے واقعات ایک اچھے اُستاد کی اصلاح و

تربیت میں نہایت مفید ثابت ہوں گے، نیز معلمین کی تربیت کے لیے جو کورس ترتیب دیے جاتے ہیں، ان میں اس کتاب کو شامل کرنا بہت نافع ہوگا۔

☆

اشاعت دوم وسوم: محترم ومکرم قارئین! مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ اشاعت اول میں یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ حضرت والا دامت برکاتہم کی نصائح اور تجربات پر مشتمل یہ مجموعہ مدرس کی اصلاح وتربیت میں معاون ثابت ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل وکرم سے حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کے تیر بہدف تدریسی تجربات اور پُر اثر کلماتِ نصیحت کو اہل فن اصحابِ مدارس نے نہایت قدر کے ہاتھوں لیا۔ پہلی اشاعت چند ماہ میں ختم ہوتی محسوس ہوئی تو بغیر کسی ترمیم واضافے کے دوسری اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ اسی طرح کچھ ہی عرصے بعد شائقین کی فرمائش پر اس کا تیسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر لایا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور ہمارے اکابر کی خاص کرامت ہے کہ کتاب کا جوں جوں تعارف بڑھ رہا ہے، اس کی طلب میں مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

اشاعت چہارم: اشاعتِ چہارم کو ضروری اضافات اور تصحیحات کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس موقع اغلاط کو پوری توجہ کے ساتھ درست کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی۔ اس اشاعت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ استاذ الاساتذہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصال سے چند روز قبل کتاب کو نہ صرف مکمل مطالعہ فرما کر تقریظ اور تاثرات تحریر فرمائے، بلکہ دوران مطالعہ انہیں جو تعبیرات یا مقامات قابل غور محسوس ہوئے، انہیں نشان زد فرما کر مفید مشورے بھی تحریر فرمائے۔ ایسے مقامات میں جہاں تبدیلی کی گئی ہے، اسے بولڈ کر کے نمایاں کر دیا گیا ہے۔ اللہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو نور سے بھر دے۔ انہیں بھی عشاقِ قرآن میں شامل فرما کر حضرت کے طفیل ہم گناہ گاروں کا حشر صدیقین، شہدا اور صالحین میں فرمادے۔

اشاعتِ پنجم: اس وقت آپ کے ہاتھوں میں بفضلِ خدا کتاب کا ''پانچواں'' ایڈیشن

ہے۔اس ایڈیشن میں عنوانات اور ترتیب میں کچھ ترمیمات کی گئی ہیں۔ساتھ ساتھ پچاس سے زائد صفحات کے بقدر نیا مواد بھی شامل ہوا ہے۔ یہ مواد دراصل حضرت اقدس حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم سے کیے گئے دو انٹرویوز پر مبنی ہے، جو مختلف چینلز کے دستاویزی پروگراموں کے لیے صحافی حضرات نے کیے تھے،جنہیں ضبط و ترتیب سے گزار کر بطور ضمیمہ کتاب کا حصہ بنادیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کتاب اپنی اثر پذیری کے ساتھ اہل فن کو قیمتی تجربات اور قدم بہ قدم رہنمائی سے ہمیشہ مالا مال کرتی رہے گی۔

☆

اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کو صحت وعافیت اور خدمتِ قرآن کی خصوصی توفیق کے ساتھ حیاتِ طویل عطا فرمائے اور ہم سب کو حضرت کی زندگی کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔نیز "اقرأ روضۃ الاطفال" کے ناظم مفتی خالد محمود صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے عظیم عطا فرمائے،جن کا مشورہ اور تعاون اس کتاب کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا۔آمین،یارب العالمین!اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اگر آپ کی نظر میں کوئی قابل اصلاح بات آئے یا آپ کے ذہن میں کوئی مفید مشورہ ہو تو ازراہِ کرم ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ یا اضافہ کیا جاسکے۔

بندہ

محمد حسین/محمد عمر فاروق

جمادی الاولیٰ 1437ھ/ربیع الثانی 1445ھ

کچھ صاحبِ کتاب کے بارے میں

(از: مرتب عفااللہ عنہ)

مختصر سوانحی خاکہ:

حضرت اقدس، حضرت مولانا قاری محمد یاسین صاحب مدظلہم کا تعلق ایسے خاندان سے ہے، جنہوں نے 1947ء میں لاکھوں مہاجرین کے ساتھ اس مملکتِ خداداد کی طرف ہجرت کی تھی۔ حضرت کے والد محترم جناب حاجی عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ انڈیا کے ضلع کرنال کی ایک بستی شاہ آباد میں رہتے تھے۔ حضرت کی پیدائش، قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل 1946ء کے اوائل میں اپنے آبائی علاقہ ضلع کرنال، بستی شاہ آباد میں ہوئی۔ 1947ء میں جب حضرت قاری صاحب کی عمر تقریباً پونے دو سال تھی، آپ نے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی۔ پاکستان پہنچنے پر پہلا پڑاؤ مظفر گڑھ میں عارضی طور پر ہوا۔ یہاں آ کر حضرت قاری صاحب کا باقی خاندان تو خان گڑھ چلا گیا۔ آپ کے والد محترم نے ملتان جانے کو ترجیح دی۔ شہر اولیاء میں پہنچ کر گھنٹہ گھر کے قریب کسی رشتہ دار کے ہاں مقیم ہوئے۔ کچھ ہی عرصے بعد مستقل طور پر محلہ آغا پورہ خونی برج منتقل ہو گئے۔

حضرت کے والد محترم جب پاکستان منتقل ہوئے تو ذریعہ معاش کے طور پر کالونی ٹیکسٹائل مل میں ملازمت اختیار کی۔ یہ مل ملتان سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ کافی عرصہ تک اسی میں کام کیا۔ دیانت و امانت کا یہ حال تھا کہ مل والوں نے مشینری کی خرید و فروخت وغیرہ کا سارا کام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم نے اپنے والد محترم رحمہ اللہ سے متعلق فرمایا:

"والد صاحب جناب حاجی عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی دیانت و امانت کی وجہ

سے کالونی ٹیکسٹائل مل کی دوسری شاخیں جو بھکر اور نوشہرہ میں تھیں، ان کا بھی آرڈر مل گیا۔ جس کی وجہ سے ایک بہت بڑی ورکشاپ قائم کی۔ کاروبار کی وسعت کی وجہ سے مالی وسعت وفراوانی بھی بہت ہوئی۔ فرمایا کرتے تھے: "میں نے اپنے بیٹے کو قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے وقف کیا ہے، یہ اسی کی برکات ہیں۔"

تعلیم کا آغاز:

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سے قرآن پاک کی خدمت کا عظیم الشان کام لینا تھا، اس لیے حفظِ قرآن کی درس گاہ آپ کی کم سنی کی اچھل کود اور بھاگ دوڑ کا میدان قرار پائی۔ آپ کے دادا جی صبح سویرے آپ کو اپنے کندھے پر بٹھا کر محلہ قدیر آباد کی ایک مسجد میں لے جاتے۔ وہاں مسجد کے پیش امام میاں عبدالرحمٰنؒ نے حفظ کی درسگاہ لگائی ہوئی تھی۔ وہیں مسجد میں لڑکوں کو پڑھتے دیکھتے اور بچگانہ شرارتیں کرتے۔ شام کو جب دادا جی واپس آتے تو آپ کو بھی لے آتے۔ اس طرح گویا آپ نے ہوش ہی درسگاہ میں سنبھالا۔ 8 سال کے ہوئے تو والد صاحب نے محلے کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ اب آپ صبح کے وقت اسکول کی تعلیم حاصل کرتے۔ شام کو اپنے محلے کی مسجد جو "مینار والی مسجد" کے نام سے معروف تھی، وہاں جاتے اور ناظرہ قرآن پاک پڑھتے۔ جامعہ خیر المدارس ملتان کے استاذِ حفظ، حافظ عبدالرحیم صاحب پیش امام تھے۔ آپ حافظ صاحب کے پاس پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے حکم سے ہر روز مسجد کی صفائی بھی کرتے۔ حافظ صاحب کا معمول تھا کہ عصر کے وقت اپنی درس گاہ خیر المدارس سے مسجد میں منتقل کر لیتے اور عشا تک وہیں پڑھائی ہوتی تھی۔ یوں حضرت قاری صاحب مدظلہم العالی نے پرائمری کے ساتھ ساتھ ناظرہ قرآن مکمل کر لیا۔

مدرسے میں باقاعدہ داخلہ:

حافظ عبدالرحیم صاحب نے آپ کے والد صاحب پر زور دیا کہ بچے کو حفظ کروائیں۔ ان کے اصرار پر آپ کے والد ماجد نے آپ کو جامعہ خیر المدارس میں حفظ کے لیے داخل کروا دیا۔ داخلہ کروانے اور داخلہ دینے والوں کا اخلاص کہ اس کے بعد پھر اسی تعلیم و تعلم کے ہو رہے۔

زندگی بھر علمِ دین سے منہ موڑنے کی نوبت آئی اور نہ ہی مادرِ علمی کو چھوڑا۔ آپ کے لیے قاری محمد دین رحمۃ اللہ علیہ کی درس گاہ کا انتخاب ہوا۔ آپ نے خدا کا نام لے کر کلامِ الٰہی کو لوحِ قلب پر منتقل کرنا شروع کیا اور تین سال میں مکمل کر لیا۔ تکمیل کے موقع پر ایک پُر وقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر اس زمانے کے نوجوان خطیب قاری حنیف ملتانی کو مدعو کیا گیا تھا۔ خاندان کے سارے افراد نے اس خوشی میں شرکت کی اور ڈھیروں دعاؤں اور مبارک باد سے نوازا۔

حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نیاز مندی:

حفظِ قرآن کی تکمیل ہوتے ہی والد صاحب نے دوبارہ اسکول میں داخل کروا دیا۔ چھٹی جماعت کی کتابیں بھی خرید لی گئیں، مگر پھر ایک واقعہ پیش آیا اور آپ ہمیشہ کے لیے دینی علوم سے منسلک ہو گئے۔ آپ کے خاندان کے ایک بزرگ حاجی عبدالحمید نے راہ چلتے والد صاحب سے بچے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اپنے فیصلے کے بارے میں آگاہ کیا۔ حاجی صاحب نے نہایت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ بغیر "گردان" کے قرآن پاک بھولنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی پیشکش کی کہ میں خود اپنی معرفت سے ان کو حضرت قاری رحیم بخش صاحب کے پاس داخلہ دلوا دوں گا۔ حاجی صاحب، حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کے نیاز مندوں میں سے تھے۔ آپ کے والد محترم، حاجی عبدالحمید کی رائے سے متفق ہو گئے۔

اگلے ہی دن حاجی صاحب آپ کو لے کر حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ داخلے کی درخواست کی، مگر حضرت نے انکار کر دیا اور عذر پیش کیا کہ داخلے کی مقدار پوری ہو چکی ہے۔ مزید گنجائش نہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کی ملک گیر شہرت اور بلند تر معیار کے باعث لوگ ماہِ رجب میں ہی داخلے کی درخواستیں جمع کرا دیتے۔ شعبان میں قرعہ اندازی کی جاتی۔ جن کا نام نکل آتا، انہیں داخلہ مل جاتا۔ عید الفطر کے بعد بلا تاخیر، پُرسکون اور بھرپور انداز میں پڑھائی شروع ہو جاتی۔

حاجی صاحب جب حضرت قاری صاحب مدظلہم کو لے کر پہنچے تو حضرت والا کے ضابطے

کے مطابق اب کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس نئے داخلے سے معذرت کرلی، تاہم حاجی عبدالحمید نے لجاجت کے ساتھ اصرار کیا۔ ان کے دیرینہ تعلقات اورمنت سماجت کے پیش نظر حضرت نے داخلہ قبول فرمالیا، مگرایک شرط عائد کردی۔

فرمایا کہ 'محمد یاسین' کا داخلہ اس شرط کے ساتھ منظور ہے کہ گردان کے بعد اسے مکمل عالم بنایا جائے۔ حاجی صاحب نے ہامی بھرلی۔ اس طرح آپ ایک ایسے جوہری کے پاس پہنچ گئے جو لعل وجواہر کی تراش خراش کے فنِ نازک سے خوب خوب آشنا تھا۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت دومہینے سے بھی کم عرصے میں بیس سے زیادہ پارے نکال لیے اور یوں بقرعید سے پہلے ہی گردان مکمل ہوجانے کی توقع تھی، مگر پارہ 23 پر آپ کا سبق رکوا دیا گیا، کیونکہ حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تکمیل گردان کی کم ازکم مدت بقرعید تھی۔ عید الاضحیٰ کے فوری بعد آپ نے گردان مکمل کرلی۔ اس کے بعد رمضان تک ہرروز صبح سے شام تک 15 یا 20 پارے حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھ کر سناتے۔ اس طرح سات، آٹھ ماہ میں آپ نے سیکڑوں بار گردان نکالی۔ اس غیر معمولی محنت اور دہرائی کی برکت ہے کہ آج پیرانہ سالی میں بھی اس قدر پختگی ہے، جس کی مثال نہیں ملتی۔

درسِ نظامی:

مجدد وقت حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے گردان مکمل کرنے کے بعد آپ نے شرط کے مطابق خیرالمدارس میں ہی درس نظامی کا آغاز کردیا۔ اس دوران بھی آپ نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اساتذہ کرام کے منظورِنظر رہے۔ 1970ء میں دورہ حدیث شریف سے فراغت پائی۔ آپ کے مشہور اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

1- حضرت مولانا خیرمحمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ
2- حضرت علامہ محمد شریف صاحب کشمیری رحمہ اللہ
3- حضرت مفتی محمد عبداللہ صاحب ملتانی رحمہ اللہ
4- حضرت مولانا محمد شریف صاحب جالندھری رحمہ اللہ

5- شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ

6- حضرت مولانا منظور احمد صاحب رحمہ اللہ

7- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ

8- حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ

9- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صدیق صاحب رحمہ اللہ

تدریس سے ''اہتمام'' تک:

آپ نے طالب علمی کا پورا زمانہ اپنے استاد حضرت قاری رحیم بخش رحمہ اللہ کے مشورے سے گزارا تھا۔ اس لیے فراغت کے بعد بھی اپنے تمام تر رجحانات اور دلچسپیاں اپنے محسن و مربی کی جھولی میں ڈال دیں۔ استاد محترم نے اس موقع پر وہ فیصلہ صادر فرمایا جو بظاہر توقع کے خلاف تھا۔

آپ کو عالم دین ہونے کے باوجود حفظِ قرآن کی تدریس کا مشورہ دیا۔ آپ نے اسے بسروچشم قبول فرمالیا۔ رحیم یار خان کے لیے تشکیل ہوئی۔ وہاں ایک مسجد میں پڑھانا شروع کیا۔ تقریباً دو سال تک تدریس کرنے کے بعد کچھ اعذار کی بنا پر حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی مشاورت سے رحیم یار خان کو خیر باد کہہ دیا۔ دوبارہ استاد محترم کے حکم سے فیصل آباد، گلبرگ میں مدرسہ ''ام المدارس'' میں پڑھانا شروع کیا۔ سوا سال تک یہاں تدریس کرنے کے بعد کچھ معزز اشخاص کی درخواست و اصرار پر فیصل آباد، ماڈل ٹاؤن ہی میں واقع ''باغ والی مسجد'' میں بحیثیت مدرس آپ کی تشکیل ہوئی۔

1973ء میں اسی مسجد میں مدرسہ ضیاء القرآن کی بنیاد رکھی۔ اس دوران آپ کو اپنے اساتذہ کی مکمل و مسلسل سرپرستی حاصل رہی۔ بڑے حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمہ اللہ بھی تشریف لاتے رہے۔ بعض مرتبہ ایک ایک ہفتہ بھی قیام فرمایا۔ اسی طرح حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تاحیات تشریف لاتے رہے۔ 1990ء میں جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن کے قیام کے بعد شہر، اندرون و بیرون ملک (ملائشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، کینیا، ناروے میں)

کئی مدارس آپ کی سرپرستی میں قائم ہو چکے ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں وہ مدارس اس کے علاوہ ہیں، جو آپ کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں نے قائم کیے ہیں۔

پاکستان کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں حضرت کے شاگرد موجود نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے لگائے ہوئے اس گلشن کو آباد و شاداب رکھے اور اس کے پھولوں کے علمی رنگ و بو سے پورا جہاں سدا مہکتا رہے۔ آمین۔ حضرت کی زندگی کے کچھ گوشے نہایت اختصار کے ساتھ واضح کرنے کے بعد آپ کے "آئینہ کردار" کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

اتباعِ سنت:

ایک بہت خاص بات جو علمائے دیوبند کی زندگیوں کا خاصہ ہے، وہ ہے اتباعِ سنت کا خصوصی اہتمام۔ حضرت اقدس حضرت قاری صاحب کی زندگی میں یہ خوبی بہت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ ہر کام میں اتباعِ سنت کا اہتمام فرماتے اور یہی سبق حضرت اپنے شاگردوں کو بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ صاف ستھرا سنت کے مطابق لباس، مسنون وضع قطع، حضرت اور ان کے شاگردوں کا نمایاں وصف ہے۔ کراچی سے آپ کے ایک بہت قدیم شاگرد (حضرت قاری احسان الحق، مدرسہ روضۃ القرآن، کراچی) نے اپنا مشاہدہ کچھ یوں بیان کیا: "حضرت قاری صاحب مدظلہم سے بندہ کی نیازمندی کا سلسلہ 35 سال سے قائم ہے۔ ان پینتیس برسوں میں ایک بار بھی میں نے حضرت کو نماز میں مسبوق نہیں پایا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کی تکبیرِ اولیٰ فوت ہوئی ہو۔"

خدمتِ قرآن سے عشق:

آپ کو قرآن پاک سے کس قدر لگاؤ ہے؟ شاید اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہمیشہ قرآن پاک کی خدمت کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ہے۔ تلاوت سے زبان تر رکھنا آپ کی خصوصی عادت ہے۔ ہر ایک دیکھتا ہے کہ آپ کوئی ضروری گفتگو فرما رہے ہوتے ہیں یا پھر قرآن پاک کی تلاوت۔ اس طرح آپ ایک دن میں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ تلاوت کر لیتے ہیں۔

صبح کی سیر کے دوران 7، 8 پارے تلاوت فرما لیتے ہیں۔ آپ کے توسط سے یہی وصف آپ کی اولاد میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن پاک کے الفاظ، معانی اور عملی سیرت کے طور پر اشاعت میں آپ نے اپنی استطاعت کی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آپ کی اسی فکر کا شاخسانہ ہے کہ آپ فضلائے درس نظامی کے لیے شعبہ تحفیظ القرآن سے منسلک ہونے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف حفظ کا ایسا مدرس ہو جو قرآن و حدیث کی مفصل تعلیمات سے نا آشنا ہو، جبکہ دوسرا ان سے بہرہ ور ہو، ان دونوں کی تدریس، بچوں کی تربیت اور اصلاح احوال میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔

بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ آپ سے فرمایا کہ آپ اپنے ہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے قرائے کرام میں سے کچھ مدرسین ہمیں دیں۔ حضرت قاری صاحب مد ظلہم نے شکوہ فرمایا کہ "حضرت! میرے پاس سے جتنے طلبہ بھی آپ کے ہاں درس نظامی کی تعلیم کے لیے آتے ہیں، آپ انہیں شعبہ کتب کی تدریس کے لیے ترغیب دیتے ہیں، جبکہ ان میں سے کوئی بھی شعبہ حفظ کی تدریس کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اسے ایک ہلکا کام سمجھا جاتا ہے۔" اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسباق میں اس خیال کی تردید اور علما کو شعبہ حفظ اختیار کرنے کی ترغیب دینا شروع کی۔ چنانچہ اسی سال علما کی ایک کھیپ شعبہ حفظ کی تدریس کے لیے میسر آئی۔

تصوف وسلوک:

باخدا لوگ اپنی اصلاحِ نفس سے غافل نہیں رہتے۔ وہ بلند مقامات طے کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو دشمن اصلی سے مامون نہیں سمجھتے۔ حضرت قاری صاحب نے انہی مقاصد کے پیش نظر اپنا ہاتھ سب سے پہلے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں دیا۔ حضرتؒ کے وصال کے بعد خود کو وقت کے ایک ایسے مصلح اعظم کے سپرد کیا، جو مجمع البحرین تھے، یعنی صاحب علم و تقویٰ مفتی اعظم مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ۔ آپؒ نے حضرت قاری

صاحب مدظلہم کو خلافت سے نوازا۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے رحلت فرما جانے کے بعد آپ نے حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی۔ آپ کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی خلافت سے نوازا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ نے استاذ الاساتذہ، شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمہ اللہ سے بیعت کی درخواست کی، تاہم حضرت نے بیعت فرمانے کے ساتھ ہی اجازت وخلافت کے اعزاز سے بھی نواز دیا۔ حضرت والا قاری صاحب دامت برکاتہم اپنے بزرگوں کی اس امانت یعنی طریقت و ارشاد کو آگے بڑھاتے ہوئے طالبین سلوک واحسان کو بھی فیضیاب فرما رہے ہیں۔ علما، طلبہ اور عوام کی بڑی تعداد، سلوک وتصوف کے تئیں بھی آپ سے کسب فیض کر رہی ہے۔ اسی عظمتِ شان کے ساتھ حضرت والا قاری صاحب دامت برکاتہم اصلاح وارشاد، تدریس اور انتظام واہتمام کے ذریعے سے خلق خدا کی نفع رسانی سے بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔ أدام الله ظلالهم سرمداً.

سادہ زندگی:

ایک بات جو حضرت کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور بہت اہم ہے، وہ ہے آپ کا سادہ طرزِ زندگی۔ خوراک، پوشاک اور رہائش سب کچھ اسی وصف کا آئینہ دار ہے۔ ہر طرح کے تکلفات سے آپ کوسوں دور ہیں۔ 1973ء سے مدرسے کے مہتمم ہوئے، مگر آج تک کوئی دارالاہتمام نہیں بنایا۔ آج بھی اپنی درس گاہ میں بیٹھے سارے کام نمٹاتے نظر آتے ہیں۔ دو بڑے مدارس، ادارے کی مختلف شاخیں، ان سب کے متنوع شعبے اور خرید وفروخت سے لے کر حساب کتاب تک تمام شعبوں کی نگرانی وغیرہ حضرت کی ذات والا صفات سے متعلق ہے۔ ان سب ذمہ داریوں کے باوجود اپنی ذاتی درس گاہ پھر بھی برقرار ہے۔ خدمت قرآن سے اس قدر عشق کی مثال شاید کہیں نہ مل سکے۔

درس گاہ کی پابندی:

حضرت والا دامت برکاتہم کے ابتدائی زمانے کے ایک شاگرد (برادر کبیر مفتی محمد

ابراہیم) کی روایت کے مطابق 88ء تا 90ء، تین سال کے دوران ... ناگزیر اسفار کے علاوہ ...درس گاہ سے کوئی ناغہ دیکھنے میں نہ آیا۔ ایک دفعہ سخت بیماری کے باعث حاضری مشکل ہوگئی تو کچھ وقت کے لیے تشریف لائے، پھر آرام کیا۔ آج ذمہ داریوں کی کثرت اور بڑھاپے کی مشکلات کے باوجود آپ کے معمولات میں بحمداللہ پابندی کی شان برقرار ہے۔

خاموش طبعی اور تواضع:

خاموشی کے ساتھ خدمت قرآن آپ کا مقصد حیات ہے۔ طبعی طور پر حضرت کم گو ہیں۔ ضرورت کی بات مختصر الفاظ میں کرتے ہیں۔ بے مقصد اور لایعنی گفتگو حضرت سے کبھی کسی نے نہیں سنی۔ آپ ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو ''چھپنے'' کو نہیں 'چھپنے'' کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے عظیم ترین کارناموں اور ملک گیر فیضان کے باوجود آپ نے کبھی اپنی خدمات کا ڈھنڈورا پیٹا نہ ہی اس بابت کسی طرح کی نشر و اشاعت کی اجازت دی۔ بہت بار کچھ عقیدت مندوں نے آپ کے حوالے سے کچھ لکھنے یا چھاپنے کی کوشش کی، مگر اجازت نہ ملی۔ قارئین کے سامنے لائے گئے یہ چند گوشے تگ و دو کا ایک طویل پس منظر رکھتے ہیں۔

صفائیِ معاملات:

آپ نے اپنے تدریسی مشاغل میں ذرا فرق لائے بغیر دین کی خدمت گار دیگر جماعتوں سے بھرپور تعاون فرمایا اور سب کو برابر درجے کی شفقت سے نوازا ہے۔ اس قدر وسیع پیمانے پر خدمات کے دوران اپنے ہم عصروں سے کچھ رنجشیں اور شکایات سامنے آ ہی جاتی ہیں، مگر حضرت قاری صاحب مدظلہم کی کمال دانشمندی اور نصرت خداوندی کہ کسی مخالف کی جانب سے کوئی معقول الزام کبھی سامنے نہیں آیا۔ اس چیز کو بہت سے حضرات نے محسوس کیا کہ حضرت نے غصے یا معمول کی حالت میں کسی عالم دین، حریف یا مخالف پر تنقید نہیں کی۔ نظم و نسق، پابندیِ اوقات، ادارہ جاتی لین دین اور آمدن و خرچ وغیرہ کے حوالے سے کوئی جھول نہ دیکھا گیا۔ وَفِی ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ [المطففین:26] (لوگوں کو اس چیز کی ہی رغبت کرنی چاہیے)

گھریلو زندگی:

اب تک آپ کے بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپے تک، شاگردی سے مدرّسی اور مہتمم ہونے تک کے جو واقعات نقل کیے گئے، وہ آپ کی عمومی زندگی کو واضح کرتے ہیں۔ راقم نے حضرت قاری صاحب مدظلہم کے گھریلو معاملات کے حوالے سے آپ کے ایک خادم اور نہایت قدیم شاگرد (مولانا مفتی محمد یونس چیمہ رحمہ اللہ، استاذ الحدیث: جامعہ دارالقرآن، فیصل آباد) کے تاثرات کچھ اس طرح تھے:

''ہمیں بچپن میں کئی سال حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کے گھر میں خدمت کا موقع ملا۔ حضرت کے گھریلو معاملات ہماری نظروں سے گزرتے رہے۔ ہم نے خادم سے لے کر بیٹوں اور بیٹی سے بیوی تک، نیز ہمسایوں، ملاقاتیوں، رشتہ داروں، قرض خواہوں، ضرورت مندوں، مخالفین، جھگڑا کرنے والوں، ہدیہ دینے یا تعریف کرنے والوں کے ساتھ ہونے والے سارے معاملات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مگر کسی بھی حوالے سے ان کو خلاف شریعت نہ پایا۔ آپ کے گھریلو معاملات بھی سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آئے۔''

اکابر کی زیارت وملاقات کے حریص:

مروجہ جلسوں کے برعکس آپ کے اسٹیج پر ہمیشہ ملک کے چنیدہ صلحا ہی جلوہ افروز نظر آئے۔ آپ بزرگوں کی برکات سمیٹنے کے حریص نظر آتے ہیں۔ بہت بار ایسا ہوا کہ آپ کسی ایسی شخصیت کو برآمد کرلائے جو اپنی ذات میں آفتاب و ماہتاب تھے، مگر خلوص وللّٰہیت کے باعث گوشہ نشین تھے۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کی درخواست پر وہ تشریف لائے اور لوگ حیران ہوئے کہ اگر حضرت انہیں منظر عام پر نہ لاتے تو ہمیں ہرگز پتا ہی نہ چلتا اور ایسی ہستیوں کا زمانہ پاکر بھی ہم ان کی زیارت کی سعادت سے محروم رہ جاتے۔

یہی وجہ ہے سال بھر کے دوران جب بھی کسی اللہ والے کی فیصل آباد آمد کا سنتے ہیں تو حاضری کی درخواست لیے خود ان کی خدمت میں جا پہنچتے ہیں۔ چنانچہ طلبا اور اساتذہ نے بے شمار علمی وعملی شخصیات کی زیارت جامعہ دارالقرآن کے آنگن میں کی۔ اس سلسلے میں حضرت قاری صاحب

دامت برکاتہم کا ایک معروف اور قابل تقلید اصول یہ ہے: ''اپنی سعادتمندی کا نہیں، بزرگوں کی راحت کا خیال کرنا چاہیے۔''

آپ اس چیز کے سخت خلاف ہیں کہ فرطِ جذبات میں بزرگوں کو مشقت میں ڈالا جائے۔ آپ کا فرمان ہے کہ ہماری سعادت، برکت اور دعا کا حصول اسی بات میں پنہاں ہے کہ اکابر کی راحت کا خیال رکھا جائے۔ ممکن ہے آپ ان کو تکلیف پہنچا کر اپنے ہاں دعوت تو دے لیں، مگر ان کی ایذا کے باعث کچھ مزید حاصل کرنے کے بجائے وہ بھی کھو بیٹھیں جو آپ کے پاس پہلے سے ہے۔

مدرسین کا تربیتی اجتماع:

یہ دنیا بھر کی ایک انوکھی مثال ہے۔ یہ دستور ہے کہ طلبا اپنے اساتذہ اور اکابر کی دعوت کیا کرتے ہیں۔ ان کی خدمت، سعادت مندی سے بجالاتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم پاکستان بھر میں تدریس کرنے والے اپنے شاگردوں کو ہر سال بلا ناغہ اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں۔ تین دن تک ان کے ساتھ نشست فرماتے اور ان کی ہر ممکن 'خدمت' کی سعی فرماتے ہیں۔

ایک عظیم باپ اور اس کے اطاعت شعار بیٹوں کا یہ محبتوں بھرا اجتماع کئی دوررس مقاصد کا حامل ہوتا ہے:

☆...... مدرسین کو حضرت بڑے قاری صاحب دامت برکاتہم کے علاوہ اپنے دیگر اساتذہ سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ بہت سے حضرات ملک کے دور دراز علاقوں سے تشریف لاتے ہیں۔ نیز اپنی مادرِ علمی کی قدم بوسی سے مشامِ جاں کو معطر اور انفاس کو تازہ کرسکتے ہیں۔

☆...... مدرسین اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات، تبادلہ خیالات اور اپنے گلے شکوے دور کرسکتے ہیں۔ تمام ساتھی تجدید ملاقات پر مشترکہ منصوبوں پر غور کرسکتے ہیں۔ اپنے مسائل کا تذکرہ کرتے اور حل تلاش کرتے ہیں۔

☆...... وہ اپنی تدریسی مشکلات، تعلیمی الجھنوں اور نجی معاملات کا حضرت اقدس حضرت

قاری صاحب مدظلہم سے ذکر کرتے اور اس کا کامیاب حل پاتے ہیں۔

☆ ...اس دوران مختلف نشستوں میں ملک بھر سے اکابر علمائے کرام، تجربہ کار شخصیات اور خانقاہی حضرات، مدرسین سے خطاب فرماتے ہیں۔اس سے شرکائے اجتماع اپنی علمی، عملی اور اصلاحی کوتاہیوں کا ازالہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

☆......تین روزہ یہ اجتماع جامعہ دارالقرآن کی سالانہ تقریب سے متصل پہلے ہوتا ہے۔ اجتماع کے ختم ہوتے ہی تقریب کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جامعہ کی تقریب کشت زعفران کا نمونہ ہوتی ہے۔اس میں تمام چوٹی کے علما وصلحا کی صحبت اور ان کے ملفوظات سے فیض یاب ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔ مدرسین کو اس مختصر وقت میں ایسی شخصیات کی زیارت سے استفادے کا موقع ملتا ہے جو انہیں شاید ہزاروں روپے اور دنوں کی مشقت سے بھی نہ مل پائے۔اس کے علاوہ تقریب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

☆......مرکز میں موجود انتظامیہ کے نظم ونسق اور اساتذہ وطلبہ کی محنت شاقہ کے مظاہر سامنے آتے ہیں۔ حفظ، تجوید وقراءت، دورۂ حدیث اور تخصص فی الافتاء سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے مناظر کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔جامعہ کی اس تقریب سے متصل جامعہ کی دیگر شاخوں کی تقریبات اور ان سے حاصل ہونے والا تربیتی وعلمی سرمایہ اس کے علاوہ ہے۔

☆......یہ تمام فوائد ومنافع اپنے شاگردوں کو دلانے کے لیے انتظام، خرچ اور ذہنی کاوش کے جاں گسل مراحل سے گزرنا، حضرت قاری صاحب مدظلہم کی اپنے تلامذہ سے والہانہ محبت کا واضح ترین ثبوت ہے۔

☆......مدرسین یہاں سے تین روزہ تربیت حاصل کرنے کے بعد نئے عزم اور جوش کے ساتھ اپنے علاقوں اور مدارس کی طرف لوٹتے ہیں۔

☆......جو مہتمم حضرات حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم سے اپنے لیے مدرس لے کر جاتے ہیں، ایسے حضرات خود اور ان مدرسین کو ہمراہ لے کر تربیت کی تجدید کر لیتے ہیں۔

☆......اس تربیتی نشست کے فوائد کے پیش نظر بعض ایسے مدرسین بھی شریک ہونے

لگے ہیں، جو حضرت کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہیں۔

بہر حال! ہماری معلومات اور مشاہدے کے مطابق بے شمار فوائد کا حامل یہ تربیتی اجتماع ایک انوکھی روایت اور حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا ایک امتیازی وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قائم و دائم رکھے۔

پہلا باب

تمہیدی گزارشات؛

ایک مثالی مدرّس قرآن

تمہیدی گزارشات

فضائل، ذمہ داریاں، وصیتیں

برادری کا ایک فرد:

ہمارے مخاطب بنیادی طور پر حضرات قرا، و مدرسین ہیں۔ کچھ عرض کرنے سے قبل یہ واضح کرتا چلوں کہ میں آپ ہی کی برادری کا ایک فرد ہوں۔ ایک ادنیٰ سا پڑھانے والا آپ ہی کا ساتھی ہوں۔ آپ اساتذہ کرام ہیں، قاری صاحبان ہیں یا قرآن پاک کے کسی اور حوالے سے خدام.... میں آپ ہی کی جماعت کا ایک رکن ہوں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میں کوئی صاحب طرز ادیب ہوں نہ ہی اسلوب تقریر سے آشنا خطیب۔ مجھے عام طور پر بیان کرنے کی بھی عادت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی کسی مسجد میں جمعہ کی تقریر بھی نہیں کی۔ بس ایک کونے میں بیٹھ کر، خالصتاً قرآن پاک کا ایک ادنیٰ مدرس بن کر کام کیا۔ لہٰذا میری باتوں کو کسی ایسے زاویے سے نہ تولیے کہ یہ کوئی صاحب فن مصنف یا ادیب ہوں گے۔ اچھے الفاظ اور عمدہ تراکیب کا انتخاب کرتے ہوئے ہمیں بات سمجھائیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس اللہ پاک دل میں جو بات ڈال دیں گے، جن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ بات کروانا چاہیں گے، یہ اسی کی طرف سے ہوگا۔ آپ سے بس اتنی درخواست ہے آپ یہ دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے وہ باتیں ذکر کرنے کی توفیق عطا فرما دیں جو میرے لیے بھی نافع ہوں اور سب پڑھنے والوں کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوں۔

میری آئندہ گزارشات کا مقصد کسی پر اعتراض کرنا ہرگز نہیں۔ کسی کو تنقید کا نشانہ بنانا بھی پیش نظر نہیں۔ صرف ان کمزوریوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان معروضات کا اولین مخاطب خود کو سمجھتا ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہم سب کو یہ کوتاہیاں دور

کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا میں بھی آپ کی برادری کا آدمی ہوں۔میرے پاس الحمدللہ 150 سے زیادہ اساتذہ کرام مدرسے میں کام کررہے ہیں۔اس کے علاوہ بیسیوں مدارس ہیں، جن کی سرپرستی بھی میرے ذمے ہے۔ان کی دیکھ بھال کے علاوہ، وہاں خدمت کرنے والے ہمارے ہاں سے گئے ہوئے اساتذہ کرام کی کچھ شکایات یا ان کی کمزوریاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ان کے ازالے کی تدابیر کے لیے منتظمین میرے پاس آتے ہیں۔اسی کے پیشِ نظر جو کچھ دیکھا، سنا یا کہنے کو موقع ملا، اس کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

برگزیدہ جماعت:

قرائے کرام سے مخاطب ہوتے وقت مجھے یقین ہے میں ایک برگزیدہ جماعت کا ہم نشین ہوں۔اس لیے کہ اس کی شہادت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔حدیث پاک میں ہے:

"قال رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ و سلَّم:إن للّٰہ أھلِیْن مِنَ النّاسِ. قالوا:یارسولَ اللّٰہِ،مَن ھُم؟ قال:ھُم أھلُ القُرآنِ،أھلُ اللّٰہِ و خَاصَّتُہٗ."

(سنن ابن ماجۃ:19،قدیمی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"بندوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔" یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا:"یا رسول اللہ! یہ کون (خوش نصیب ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ میرے خاص لوگ) ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:"یہ اللہ والے اور اللہ کے خاص بندے قرآن والے ہیں۔"

کیوں؟ اس لیے کہ صبح سے لے کر شام اور شام سے صبح تک قرآن پاک ہی ان کی سوچ اور فکر کا محور ہے۔ان کی محنت کا میدان بس اللہ کا قرآن ہے۔دوسرے الفاظ میں ان کا اوڑھنا، بچھونا واحد چیز قرآن پاک ہوتا ہے۔اللہ پاک کے اتنے قریبی لوگ یقینا بہت اونچے لوگ ہیں۔یہ اپنی خوش قسمتی پر جتنا فخر کریں، کم ہے۔

دوسری حدیث پاک میں ہے:

"خَيْرُكُمْ (وفي رواية) أفضلُكُمْ مَن تَعَلَّمَ القرآنَ وعَلَّمَهُ." (سنن ابن ماجة:19، قديمي)

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جن کا مشغلہ قرآن پاک کو سیکھنا اور سکھانا ہے۔''

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مَنْ شَغَلَهُ القُرآنُ عن ذِكرِي ومَسْألَتِي، اَعْطَيْتُهُ أفضَلَ ما أُعطِي السّائِلِين." (سنن ترمذی:184/4)

''جو قرآن پاک کی خدمت میں اس طرح مشغول ہے کہ اسے میرا ذکر کرنے اور مجھ سے مانگنے کا موقع بھی نصیب نہیں ہوتا، تو میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔''

نیز اسی حدیث میں مزید فرمایا:

"وفَضْلُ كَلامِ اللّٰهِ عَلى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلى خَلْقِه." (سنن ترمذی:184/4)

''قرآن پاک کی فضیلت دیگر کلاموں پر ایسے ہے جیسے خود اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔''

یعنی ایک طرف وہ ہے جو ایک کونے میں ہاتھ پھیلا کر بیٹھا دعا مانگ رہا ہے اور دوسرا شخص 50،40 بچوں کو لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں ان پر صرف کر رہا ہے، تو اللہ کے نزدیک ان دونوں کے اجر میں نمایاں فرق ہے اور مدرّسِ قرآن کو افضلیت، ترجیح اور امتیاز حاصل ہے۔

چوتھی حدیث پاک ہے:

"أشْرَافُ أمّتِي حَمَلَةُ القُرآنِ، وأصحَابُ اللّيلِ." (الترغيب والترهيب: 243/1، دار الكتب العلمية، بيروت)

''میری امت کے معزز لوگ، میرے امت کے شرفا، یہ حاملین قرآن ہیں (جو اپنے سینوں میں اللہ کی مقدس امانت اٹھائے ہوئے ہیں) اور وہ لوگ جو رات کو اٹھ کر عبادت کرنے

والے (تہجد گزار) ہیں۔"

حقیقت یہ ہے جب ان جیسی احادیث پر نظر جاتی ہے جو حفاظ اور خدمتِ قرآن سے منسلک ہونے والوں کے لیے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ کو سب سے زیادہ پیار ہی قرآن پاک والوں کے ساتھ ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں کا یقین نصیب فرمائے۔آمین۔

ولایت کا مختصر ترین راستہ:

ایک حدیث پاک میں اللہ تک پہنچنے کا، اللہ کے قرب کا، سب سے مضبوط ذریعہ قرآن پاک قرار دیا گیا ہے۔فرمایا:

" اِنَّکُم لَاتَرجِعُونَ اِلَی اللّٰہِ بِشَیْءٍ أَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْہُ یعنی القُرآنَ." (الترغیب والترھیب: 230/2، دار الکتب العلمیۃ)

"تم لوگ اللہ جل شانہٗ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق تعالیٰ سبحانہٗ سے نکلی ہے، یعنی کلام پاک۔"

اس کی ذرا وضاحت یہ ہے کہ خانقاہی سلسلے کی منزلِ مراد اللہ کے قرب کا حصول ہے۔ شیوخ اس مقصد کے لیے مریدین کو ان کی طبیعت، حالات اور ضرورت کے مطابق مختلف اذکار تلقین فرماتے ہیں۔اسے "سُلوک بِالذکر" کہتے ہیں۔یہ ذکر کے ذریعے سلوک و تصوف کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں۔مگر ان قرآن والوں کو اللہ تعالیٰ شانہ "سلوک بالقرآن" نصیب فرماتے ہیں۔قرآن پاک پڑھنے، پڑھانے اور اس کے لیے انتظام کی فکر کرنے کے ذریعے سے اپنے قرب کی منزلیں طے کروا دیتے ہیں۔

ہمارے حضرت، مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک دفعہ ایک بڑے بزرگ مجھ سے فرمانے لگے: "یہ وہ شخصیت ہے، جس نے اپنے آپ کو بچوں کے اندر چھپا رکھا ہے۔اسے وقت کا قطب، غوث، ابدال یا کوئی بھی نام دے دو، روحانی لحاظ سے یہ بہت اونچی سطح پر ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ پیری، مریدی کے معروف طریق کار سے ہٹ کر یہ ہر وقت

ایک عام درس گاہ میں، عام بچوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ مگر یہ ہر لحہ ولایت کی بلند سے بلند منازل طے کر رہا ہے۔ لیکن بچوں کے اندر گھرا ہونے کی وجہ سے کسی کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ کتنے اونچے مقام پر ہے۔"

اس کی مضبوط تائید ایک دوسرے واقعے سے ہوتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کا ابتدا میں اصلاحی تعلق شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب آپ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوئے اور اپنے لیے کوئی مخصوص ذکر تلقین کرنے کی درخواست کی تو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "آپ کے لیے کسی خاص ذکر کی ضرورت نہیں۔ آپ سب سے بہترین ذکر میں صبح سے شام تک مصروف ہیں۔ صرف یہ نیت کر لیا کریں کہ "اے اللہ! آپ کی رضا کے لیے بیٹھا ہوں.... پھر اس کا مسلسل استحضار بھی رکھیں۔ بس یہی آپ کے لیے کافی ہے۔"

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ مدارس کے منتظمین حضرات کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ ہم تو ناظم ہیں۔ ہمارے متعلق تو اس میں کوئی بات نہیں۔ مگر میں عرض کروں کہ آپ کا واسطہ بھی ایک ذمہ دار کی حیثیت سے صبح وشام مدرسین اور طلبہ کے ساتھ ہے۔ آپ بھی بالواسطہ طور پر قرآن پاک ہی کے خدام ہیں۔ آپ کی محنت وکوشش نے کتنے ہی خدام قرآن کو فکرِ معاش سے آزاد کیا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ بھی بلاشبہ ان بشارتوں کے مستحق ہیں۔

طالب علم، ایک امانت:

ایک مدرس کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ آپ کا طالب علم اپنے تمام تر احوال کے ساتھ آپ کے پاس امانت ہے۔ اس کی تعلیم سے لے کر تربیت اور پھر تکمیل تک ساری ذمہ داری استاد ہی کے کاندھوں پر ہے۔ اگر معلم کی کسی کمی، کوتاہی، ناجائز مار پیٹ یا ناشائستہ حرکت کی وجہ سے کوئی طالب علم تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلا گیا تو اس کی حفظِ قرآن یا خدانخواستہ دین سے محرومی استاد کے سوا کس کے نامہ اعمال میں لکھی جائے گی؟ ایسے بچے کی تعلیم سے ــ

محرومی اپنی جگہ پر لیکن اس کے سرپرست کا دینی مدارس، مذہبی علوم اور قرآن پاک کی تعلیم دینے والوں کے بارے میں جو ذہن بن جائے گا، اس نقصان کا ازالہ ممکن نہیں۔ یہ آدمی اپنی تکلیف کا دوسروں کے سامنے اظہار کرتے ہوئے ہر شخص کو بتاتا پھرے گا۔ اس طرح وہ صرف کسی ایک استاد کی ادنیٰ غلطی کی وجہ سے پورے دین دار طبقے کو بدنام کرے گا۔

یہ تو آپ کے سامنے ہے کہ آج اس دور میں مسلمانوں کا جس قدر رجوع مدارس کی طرف ہوا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں کبھی طلبہ دینی مدارس میں نہیں آئے تھے۔ پھر جو محض ایک خاص طبقے کے لوگ پہلے مدارس میں آتے تھے، اب وہ بات بھی نہیں ہے۔ اچھے اچھے بڑے گھرانوں، نیز ہر طبقہ فکر کے لوگ ...خواہ وہ کالج، یونیورسٹی میں بڑے سے بڑا پروفیسر ہے یا وہ بڑے سے بڑا ڈاکٹر یا وکیل ہے، پولیس انسپکٹر ہے یا کوئی جج وغیرہ یعنی جو بھی دنیاوی لحاظ سے معزز طبقہ سمجھا جاتا ہے...... ہمارے زمانے میں ان تمام طبقوں کے بچے دینی مدارس میں آرہے ہیں اور کثیر تعداد میں آرہے ہیں۔

اس کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ تبلیغی کام آج بڑی وسعت اور شد و مد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کے اثرات عوام الناس میں نمایاں ہو رہے ہیں۔ جو لوگ جماعت کے ساتھ لگتے ہیں، اپنی اولاد کو دین پڑھانے کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہوتا ہے اور پھر وہ مدارس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس طرح سے مدارس میں آرہی ہے۔ دوسری وجہ عصری تعلیم کا مہنگا ہونا ہے۔ معاشرے کا وہ طبقہ جس کو پسا ہوا طبقہ کہتے ہیں، بہت زیادہ اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آج تعلیم کے نام پر کاروبار اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ عام آدمی کے لیے اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس قسم کا طبقہ جو سفید پوش ہے اور وہ تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتا، اپنی اولاد کو جہالت کے داغ سے بچانے کے لیے مدارس کا رخ کر رہا ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سے طلبہ آئے دن مدارس میں آرہے ہیں۔

اللہ نے ہم سب کو کام کرنے کا اہم موقع عنایت کیا ہے۔ تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور یہ ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم طلبہ پر محنت کر کے، اچھے افراد پیدا کر کے معاشرے کو فراہم کر

سکتے ہیں۔ اگر آج ہم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا، اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھا اور پورا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مدارس پھر دوبارہ اسی پرانی نہج پر لوٹ جائیں، وہ پھر سے ویران ہو جائیں، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہم نے ان پر بھی اعتماد کر کے دیکھ لیا، یہ بھی ہمارے اعتماد پر پورے نہیں اترے۔

اپنی قدر پہچانیے:

اللہ تعالی نے اپنی آخری کتاب کی خدمت ذمے لگا کر ہمارے اوپر خصوصی فضل فرمایا ہے۔ اس بات کا اظہار اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ''وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمْ، وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيماً'' [النساء:113] اللہ تعالی فرمارہے ہیں: ''جس چیز کا تمہیں علم نہیں تھا، وہ تمہیں سکھا دیا اور یہ تم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔''

اللہ تعالی نے ہمیں کتاب دی اور حکمت و دانائی بخشی تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ہم قراء و مدرسین کے لیے یہ نعمت کئی گنا بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے ہمیں یہ کتاب عطا فرمانے کے ساتھ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول کر کے اس سے بھی بڑا فضل فرمایا۔ اس دگنی نعمت پر، دگنا شکر بھی ہمارے ذمے ہے۔ ہم شکر ادا کرتے رہیں گے تو اللہ تعالی نعمت میں اضافہ فرماتے رہیں گے۔ ارشاد فرمایا: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" [ابراہیم:7] ''اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں ضرور تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔''

یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ہمیں ''معلم'' ہونے کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت عطا فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً" کہ مجھے معلم بنا کر ہی بھیجا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاصؒ: 226/5، دار احیاء التراث، بیروت)

اس لحاظ سے ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین ہیں۔ اللہ ہمیں اس نسبت کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آپ حضرات کے بارے میں حضور علیہ السلام کا ایک اور ارشاد گرامی احادیث کے ذخیرے میں ملتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَه يُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ ." یعنی جو لوگ انسانوں کو خیر (دین) کی تعلیم دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ شانہٗ کی رحمتیں ہر آن ان پر برستی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق (فرشتے) ہر لمحہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ (كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، رقم الحديث: 28740)

خدمتِ قرآن کی اس مشغولیت اور اس پر ملنے والے بے شمار فضائل کے پیشِ نظر اگر کسی مدرسے میں ہمیں کوئی جگہ پڑھانے کو نہ ملتی اور ہم ان کے پاس جا کر کہتے کہ خدا کے لیے ہمیں پڑھانے کے لیے رکھ لو۔ اس کے عوض میں اپنے پلّے سے تمہیں کچھ نہ کچھ دوں گا، لیتا کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی بڑی بات تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہے۔ مدرسہ سب کچھ دے رہا ہے۔ مراعات بھی مل رہیں۔ تنخواہ بھی ملتی ہے، تو یہ اللہ کی مزید نعمت اور ان مدارس کا احسان ہے۔ بہت بڑی ناقدری ہوگی اگر ہم بچوں کے حقوق میں لاپروائی برتیں یا ادارے کے حقوق کا خیال نہ کریں۔

فتنے کے دور میں:

آپ کا دور، دورِ جدید کہلاتا ہے۔ طرح طرح کے ناموں کے ساتھ ... جدید ذرائع کا سہارا لے کر... قرآن پاک کے نام پر... دین کے نام پر... بعض مدارس قائم ہو رہے ہیں۔ ان مدارس کو چلانے والے باطل نظریات کے حامل ہیں۔ وہ دراصل چھوٹے بچوں کی غلط خطوط پر ذہن سازی کر کے، ان کو ہمیشہ کے لیے ایک غلط راستے پر دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں اہلِ حق کی ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہ جو ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ہمارے پاس آرہے ہیں اور ہر آنے والے دن کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے، انہیں سنبھالنا اور ان کی تربیت بھی ہمارا فریضہ ہے۔

انتظام کرنے والوں نے ہمیں ماحول مہیا کر دیا۔ ادارہ بنانے والوں نے ادارہ بنا دیا۔ قوم نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے اپنے بچے ہمارے سپرد کر دیے۔ اب ہمارا امتحان ہے۔ ہم میں

سے ہر ایک سب سے پہلے اللہ کے سامنے اور پھر قوم کے سامنے جواب دہ ہے۔ آیا ان بچوں کے حوالے سے ہم نے اپنی ذمہ داری کو نبھایا یا نہیں؟ مکرر عرض کرتا ہوں اگر خدانخواستہ ہم نے اپنے اخلاق سے... اپنے کردار سے... اپنے انتظام سے... اور اپنی محنت سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا.. تو... خدانخواستہ وہ وقت نہ آ جائے کہ یہ جو بچے ہمارے پاس آئے ہیں، ہماری ادنیٰ غلطی کی وجہ سے دوبارہ دوسری طرف لوٹ جائیں اور اس تعلیم سے ہی متنفر ہو جائیں۔

ایک مثالی مدرّس قرآن

حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مجدد القراآت:

اس دور میں اللہ جل شانہٗ نے حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حفظ قرآن کے سلسلے میں جو کام لیا ہے، بجا طور پر وقت کے علما، صلحا اور شیوخ نے انہیں "مجدد حفظ وقراآت" کے لقب سے نوازا۔ وہ اپنے فن میں اس دور کے مجدد ہیں۔ پاکستان بننے سے 4 سال پہلے حضرت ملتان تشریف لے آئے تھے۔ آپؒ کو حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ لے کر آئے تھے۔ فسادات کے وقت حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان واپس چلے گئے۔ اس کے بعد اپنے بال بچوں سمیت پھر ہجرت کر کے تشریف لے آئے۔ اسی جگہ کام شروع کیا اور چالیس سال تک مسلسل خدمت قرآن میں مشغول رہے۔

مجھے الحمد للہ! 13 سال تک مسلسل حضرتؒ کی خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان تیرہ برسوں سے پہلے کے حالات بھی ہمیں اپنے بزرگوں سے سننے کا موقع ملا۔ پھر 1970ء میں دورۂ حدیث سے فارغ ہو کر میں تدریس کے لیے چلا گیا۔ حضرتؒ کا وصال 1982ء میں ہوا۔ ان بارہ سالوں کے حالات وواقعات بھی ہمارے علم میں ہیں۔ لہٰذا آئندہ اوراق میں جو کچھ بھی آئے گا وہ حضرتؒ کی ہی تعلیم وتلقین یا صحبت کا فیضان ہے۔

درسگاہ سے عشق:

حضرتؒ کے ابتدائی زمانے کے تلامذہ سے سنا کہ حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے لیے درس گاہ کی حاضری، شروع سے ہی ایک دیوانگی شوق کے درجے میں رہی ہے۔ آپ کے ہاں

تمام دن تو تعلیم ہوتی ہی تھی، جمعے کے دن... جو چھٹی کا دن ہوتا ہے... بھی یہاں صبح نماز سے ایک گھنٹہ پہلے تعلیم شروع ہوتی اور تقریباً 9 بجے تک جاری رہتی۔ اس کے بعد چھٹی کی جاتی۔

ابھی تک وہ حضرات بقیدِ حیات ہیں جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ جب ہم شروع میں پڑھتے تھے، حضرتؒ کے ہاں عید والے دن بھی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ تعلیم ہوتی۔ پھر ہم گھروں کو جاتے۔ کپڑے بدل کر اپنے والدین کے ہمراہ عید گاہ چلے جاتے۔ ذرا آج کے اس دور کے ساتھ اس کا تھوڑا سا موازنہ کر کے دیکھیے۔ کیا ذہن کے کسی گوشے میں یہ تصور بھی آ سکتا ہے کہ یہ بھی اوقاتِ تعلیم ہو سکتے ہیں؟!

پابندیٔ وقت:

اپنے 40 سالہ طویل تدریسی دورانیے میں کسی ایک دن بھی آپ نے غیر حاضری نہیں کی۔ اگر آپ یہ بات جامعہ خیر المدارس کے مہتمم یا وہاں کے اساتذہ سے پوچھیں کہ "بھئی! ہم نے ایسے سنا ہے کیا یہ درست ہے؟" تو وہ سب اس چیز کی گواہی دیں گے، ان شاء اللہ!

ہم مدرّسین کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس بارے میں سوچیں کہ کیا وہ ہماری ہی طرح کے انسان نہ تھے یا کوئی اور مخلوق تھے؟ کیا ان کی ضروریات نہیں تھیں یا وہ ان سے خالی تھے؟ حضرت کی شادی ہوئی تھی۔ آپ صاحب اولاد بھی تھے۔ بیماری بھی آئی۔ اموات بھی ہوئیں... سب کچھ ہوا۔ لیکن ان تمام امور کے ہوتے ہوئے کسی ایک دن کی بھی غیر حاضری نہیں ہے۔

وہ کون سا ایسا عمل کا جذبہ دل میں بھرا ہوا تھا، جس نے اس درجہ تک پہنچایا کہ چالیس سال میں کوئی بھی غیر حاضری نہیں۔ پھر نہ صرف یہ کہ غیر حاضری نہیں، بلکہ اوقات کی بھی پابندی تھی۔ ایسا نہیں کہ حاضری کا وقت 7 بجے ہے تو آپ 8 بجے آ گئے۔ دس بجے حاضر ہو گئے یا صرف شام کو پڑھا لیا اور چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے آدھا گھنٹہ یا پندرہ منٹ پہلے آپ درس گاہ میں موجود ہوتے تھے۔ بہت سے بچے ابھی درس گاہ میں نہیں پہنچے ہوتے تھے، لیکن حضرت ان سے پہلے ہی موجود ہوتے۔ مدرسے سے حضرت کا مکان تقریباً 3 کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

ہزاروں میں سے کوئی شخص بھی اس بات کی گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ اس نے دیکھا ہو کہ حضرت، عمر بھر میں کبھی تاخیر سے پہنچے ہوں۔ کیا مجھ سمیت سب اس بات کا تصور کر سکتے ہیں؟ ہم سب میں سے کوئی اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے کہ میں بھی درس گاہ میں اسی طرح پابندی کرتا ہوں؟ ایک دن نہیں، دو نہیں، سالہا سال تک انہوں نے ایسا کر کے دکھایا۔ سبحان اللہ!

دو تصویریں:

ایک مرتبہ اخبارات میں ایک خبر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے کسی جج کا بیٹا ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ ان جج صاحب نے صرف ایک دن کی چھٹی کے بعد، وفات سے اگلے ہی دن عدالت میں حاضری دی اور اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہ خبر عوام، صحافیوں اور اربابِ حکومت کے نزدیک بڑے اچنبھے کی چیز تھی۔

بیٹے کی شہادت کے اگلے ہی دن ڈیوٹی دینے کو ایک کارنامہ قرار دیا گیا اور اسے شہ سرخیوں میں جگہ دی گئی۔ یہ واقعی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر ہمارے حضرات کا جنہوں نے کبھی اپنے آپ کو تشہیر کا محتاج نہیں رکھا، ان کے کارنامے تو اس سے بھی بہت زیادہ اونچے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت کا ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں۔

حضرت رحمہ اللہ کی ایک صاحبزادی کئی دن سے مسلسل بیمار تھیں۔ ان کی بیماری کے دوران حضرت رات بھر ان کی دیکھ بھال کرتے اور دن میں حسبِ معمول درسگاہ میں حاضر ہوتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ ادھر حضرت کے معمول میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ درس گاہ کی حاضری اسی طریقے سے جاری رہی۔

پھر ایک دن اچانک تہجد کے وقت بچی کا انتقال ہو گیا۔ آپ اس رات بھی اس کی تیمارداری میں مصروف رہے تھے۔ اس عالم میں استقامت کی انتہا دیکھنے میں آئی۔ بچی کی میت گھر میں موجود تھی۔ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے گھر والوں سے صرف اتنا کہا: "میں اتنے بجے مدرسے سے واپس آؤں گا۔ اس سے پہلے تجہیز و تکفین مکمل کر کے رکھنا۔" اور گھر سے نکل گئے۔

یہ کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے واقعات ذکر نہیں کر رہا۔ یہ موجودہ دور کے

حالات اور واقعات ہیں۔ آج ہم پرانے بزرگوں کے حالات سن کر، معمولی سی زبان ہلا کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں:

''اجی! یہ تو پرانے اکابر کے واقعات ہیں، آج کل یہ کہاں ہو سکتا ہے۔''

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر والوں کو بس اتنا کہہ کر گھر سے چلے گئے۔ پھر پورا دن درس گاہ میں بیٹھ کر پڑھایا۔ مدرسے میں بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ دوپہر تک مکمل پڑھانے کے بعد آپ گھر تشریف لے آئے۔ دیگر اساتذہ اور احباب بھی ہمراہ آ گئے۔ میت اٹھائی اور قبرستان چلے گئے۔ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ حضرت قاری صاحب جنازہ ادا کر کے وہیں سے سیدھا مدرسے آ گئے۔ چنانچہ ظہر کے بعد پڑھائی کا وقت شروع ہونے سے پہلے حضرت درس گاہ میں موجود تھے۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ جج صاحب نے بیٹے کے حادثے پر صرف ایک دن کی چھٹی کی اور اگلے روز عدالت میں حاضر ہو گئے۔ آج کے دور میں یہ بھی کمال ہے۔ مگر اس سے بڑا کمال یہ ہے کہ میت گھر پر ہے۔ اس وقت بھی غیر حاضری نہ کی اور معمولات میں ذرا فرق لائے بغیر اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ جن لوگوں نے اس طرح قربانیاں دیں اور ایسی عرق ریزی سے اپنی ذمہ داری کو نبھایا تو پھر کیوں ان کے کام میں قبولیت نہ ہو؟ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ان کے جو شاگرد آپ کو ملیں گے، ان کے پیچھے یہی قربانیاں اور اخلاص وللّٰہیت کارفرما ہے۔

عجیب دعائیں:

حضرت رحمہ اللہ اپنی زندگی میں اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! مرنا تو ہر کسی نے ہے۔ میری موت ایسے وقت میں آئے کہ اس کی وجہ سے دوسرے مدرسین اور ان کی درس گاہوں کا نقصان نہ ہو۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ آپؒ کا انتقال 12 ذوالحجہ کی رات کو ہوا۔ مدرسین کا کوئی حرج نہیں ہوا کیونکہ یہ ایام چھٹیوں کے تھے۔ اللہ اکبر!

حضرت کی دوسری دعا اکثر یہ ہوتی تھی:

''اے اللہ! جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب انہیں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ فضائل اعمال میں حضرت ثابت بنانی رحمہ اللہ کا لکھا ہے۔ یہ حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ لوگ جب ان کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ قبر پر سے ایک اینٹ اپنی جگہ سے ذرا ہٹ گئی۔ لوگ اسے درست کرنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ حضرت ثابت بنانیؒ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ (فضائل اعمال: 425، 426، مكتبة البشرى)

حضرت قاری صاحب ان واقعات کا حوالہ دے کر دعا مانگتے: ''اے اللہ! جن کو نماز کا شوق ہوتا ہے، ان کو آپ نماز پڑھنے کا موقع عطا فرما دیتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو قبر میں میرے لیے درس گاہ بنا دیجیے، تاکہ میں وہاں بھی قرآن پاک پڑھاتا رہوں۔'' کیا ذوق تھا حضرت کا!

اکثر یہ دعا بھی فرماتے اور ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کا تذکرہ بھی فرماتے۔ ایسا لگتا ہے، حضرت رحمہ اللہ کی یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی ہوگی۔ اس طرح کہ حضرتؒ کے بہت سے طلبہ جنہوں نے شہادت پائی۔ بہت سوں کا فطری انتقال بھی ہوا۔ ان جانے والوں کو بعد میں متعدد حضرات نے خواب میں دیکھا کہ حضرت کی درس گاہ لگی ہوئی ہے۔ یہ شہدا اور دیگر وفات پاجانے والے تلامذہ حضرتؒ کے گرد بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔

پتا چلا کہ انہیں اپنے مشن سے کس قدر لگن تھی۔ قرآن کریم کا شوق اور جذبہ دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اسی کی خواہش فرما رہے ہیں۔ یہ خالی زبانی باتیں نہیں۔ آپ کی مصروف زندگی کو پرکھ کر دیکھیے۔

اس کے پیشِ نظر کچھ بعید نہیں، اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد... عالم برزخ میں... بھی آپؒ کے لیے ایسے حالات پیدا فرما دیے ہوں۔

قراآت کی تدریس:

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جن طلبہ نے باقاعدہ حفظ کیا، ان کی تعدا

ہزاروں میں ہے۔ جنہوں نے آپ سے قراآت سبعہ، شاطبیہ اور جزری وغیرہ پڑھی، ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ تاہم اس فن کی تدریس کے لیے باقاعدہ مدرسے کی جانب سے کوئی شعبہ قائم نہیں تھا۔ اس کے باوجود سیکڑوں بچوں نے قراآت عشرہ کیسے پڑھ لی؟ حضرت کی دیگر خصوصیات کی طرح یہ بھی آپ کی زندگی کا ایک انوکھا پہلو ہے۔

ترتیب اس کی کچھ یوں تھی کہ حضرت کے پاس حفظ کر کے جو بچے درسِ نظامی میں چلے جاتے، ان کے لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے پابندی تھی کہ ان کا جو گھنٹہ بھی فارغ ہو، اس وقت سیدھا حضرت کی درس گاہ میں چلے آئیں۔ ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا کہ متوسطہ سالِ اوّل سے لے کر دورہ حدیث شریف تک کے تمام طلبہ، جس کا بھی کوئی گھنٹہ فارغ ہوتا، وہ اس وقت میں حضرت کے پاس ضرور حاضر ہوتا۔ آج کوئی ماں کا لال ایسا ضابطہ بنائے اور اس پر عمل کروا کے دکھائے، ممکن ہی نہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں کہ ان حضرات کے لیے فارغ گھنٹے میں آنا ضروری تھا، بلکہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پابندی یہ بھی لگائی ہوئی تھی کہ جب دوپہر کو مدرسے سے چھٹی ہو جائے اور اسباق ختم ہو جائیں تو ایک گھنٹے کے لیے پھر آیا کریں۔

جن بچوں کی ''قراءت'' شروع ہو چکی ہوتی تھی، ان کو اپنے طور پر عصر سے مغرب تک لے کر بیٹھتے۔ اسی طرح پر جب آپ دوپہر کو آرام کے لیے بستر پر لیٹے ہوتے تب بھی ''قراآت'' والے 5، 7 طلبہ آپؒ کے ارد گرد اپنے اسباق سنا، یاد ہرا رہے ہوتے تھے۔ یوں اپنے خارجی اور آرام کے اوقات میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قراآت کے فن کو آگے منتقل کیا۔

مدرسین کرام! آپ ہی بتایئے! جو شخص محنت اور لگن سے صبح سے لے کر دوپہر تک پڑھاتا ہے، کیا دوپہر کو اس کے اندر اتنی سکت ہوتی ہے کہ مزید پڑھا سکے؟ دل لگا کر اور اپنی جان مار کر پڑھانے والوں کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر دوپہر کو آرام نہ کیا جائے تو طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔

لیکن ہمارے حضرت آرام کے وقت کو بھی پڑھانے پر صرف کرتے۔ عصر کے بعد کا وقت بھی آرام کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام مدرسین کا ہی معمول ہوتا ہے۔ لیکن حضرت قاری صاحب

اس وقت بھی بیٹھ کر قرآن کریم پڑھاتے تھے۔ ان اوقات میں پڑھنے والے سب بچے ''قراآت'' کے ہی ہوتے تھے۔

یہ ہے مدرِّسی! اسے کہتے ہیں لگن! اور جن کی یہ باتیں آپ کے سامنے آئیں وہ ہمارے اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔

استاد سے عشق:

بڑے حضرت.... حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ.... مسجد سراجاں حسین آگاہی، ملتان (جہاں حضرت رحمہ اللہ امامت فرماتے تھے) میں تشریف لاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات تو کافی طویل قیام بھی فرماتے تھے۔ اُن دنوں ہمارے حضرت .... قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ علیہ.... اپنے گھر آنا جانا موقوف فرما دیتے تھے۔ مستقل قیام مسجد سراجاں میں ہی رکھتے تھے۔

نظام الاوقات کی ترتیب اس طرح سے ہو جاتی تھی:

فجر کے بعد مدرسے کے وقت سے پہلے خیر المدارس اپنی درسگاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ دوپہر کی چھٹی کے وقت واپس مسجد سراجاں اپنے شیخ رحمہ اللہ کے پاس آجاتے۔ ظہر مسجد سراجاں میں ہی ادا کرتے .... جو اوّل وقت میں 1 بجے ہوتی تھی ...... نماز سے فارغ ہو کر درسگاہ کے وقت سے پہلے پھر مدرسہ تشریف لے جاتے۔ عصر کی چھٹی کے وقت معمول کے مطابق مسجد سراجاں تشریف لے جاتے اور عصر کی نماز ادا فرماتے۔ پھر فجر کے بعد مدرسے کے وقت تک یہیں تشریف رکھتے۔ جب تک شیخ رحمہ اللہ کا قیام ملتان میں رہتا، یہ ترتیب مستقل تھی۔ گرمی، سردی یا کسی اور وجہ سے اس میں ذرہ برابر بھی تخلف نہ تھا۔

بحمد وتعالیٰ جب تک میں بطور طالب علم حضرت کی خدمت میں رہا.... تقریباً 13 سال.... سائیکل پر لانے، لے جانے کی خدمت بھی میرے حصے میں تھی۔ اس ترتیب اور اس واقعے میں کتنی بہترین اور قابل تقلید مثال ہے، درسگاہ سے ایک منٹ کے لیے بھی غیر حاضری برداشت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ کی خدمت میں بھی کتنا وسیع وقت دے رہے ہیں۔

ادب کی اعلیٰ مثال:

اپنے شیخ، حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمہ اللہ کی مجلس میں کبھی بھی نہیں دیکھا گیا کہ حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ چوکڑی مار کر بیٹھے ہوں۔ دوزانوں اور یک زانوں بیٹھتے۔ حالانکہ حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ شوگر کے مریض، معمر اور بدن بھی قدرے وزنی تھا، نیز یہ کہ شیخ، قاری فتح محمد صاحب رحمہ اللہ نابینا بھی تھے۔ ان کو کیا معلوم کہ کون کس طرح بیٹھا ہے۔

نیز جب حضرت قاری رحیم بخش صاحب اپنے شیخ کی خدمت میں ہوتے اور جماعت کا وقت ہو جاتا، ہمیشہ دیکھا گیا کہ حضرت قاری رحیم بخش صاحب اپنے شیخ کے برابر میں کھڑے ہوتے، نماز باجماعت سے فراغت کے بعد نہ اپنی جگہ چھوڑتے اور نہ ہی نماز وغیرہ میں مشغول ہوتے، یہاں تک کہ شیخ خود نماز میں مشغول ہو جائیں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ شاید شیخ نے کچھ فرمانا ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ فرمانا چاہیں اور میں موجود نہ ہوں۔

حضرت رحمہ اللہ کا ذوق عبادت وتلاوت:

اس حوالے سے چند مشاہدات ملاحظہ فرمایئے:

حضرت رحمہ اللہ کا یہ معمول تو ہر خاص وعام کے علم میں ہے کہ حضرتؒ رمضان المبارک میں دس پارے یومیہ سناتے تھے۔ رمضان المبارک میں تقریباً دس قرآن پاک تراویح میں سناتے تھے۔ عشاء سے لے کر سحری سے کچھ دیر قبل تک تراویح میں مشغولیت رہتی۔ بعض دفعہ کراچی کے اکابر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ علیہ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات بھی تراویح میں شرکت فرماتے تھے۔

رات بھر کی اس مشقت کے باوجود دن میں بھی معمولی آرام فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دن کا اکثر حصہ تصنیف وتالیف اور مہمانوں، شاگردوں وغیرہ سے ملاقات میں صرف ہوتا۔

بڑے حضرت جن دنوں ملتان تشریف لے آتے، مسجد سراجاں میں قیام کے دوران بہت

وقت خدمت میں حاضر رہنے کو ملتا۔ سردی کی راتوں میں صبح صادق سے تقریباً تین گھنٹے قبل بیدار ہو کر تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ اسی قیام میں بعض دفعہ دو دو گھنٹے کے سجدے کا بھی مشاہدہ کیا۔ بعض دفعہ دو یا اس سے بھی زائد گھنٹے مسلسل دعا میں مشغولیت دیکھی۔

اکثر فجر کی نماز میں امامت فرماتے اور طویل قراءت فرماتے تھے۔ دو رکعتوں میں عموماً ایک پاؤ سے زائد کی تلاوت ہوتی تھی۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر ضروری تسبیحات کے بعد دعا شروع فرماتے، عام طور پر سورج طلوع ہو جاتا تھا۔ یہ منظر تو یہاں فیصل آباد تشریف لانے پر دیکھنے والے اور دعا میں شرکت کرنے والے اب تک یاد کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے ان اکابر کے ذوقِ عبادت کا کچھ ذرہ ہم نام لیواؤں کو بھی نصیب فرمادیں۔

اپنے حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ کو کہیں بھی، کسی بھی نماز میں نہیں دیکھا گیا کہ جماعت کھڑی ہو رہی ہو اور اقامت کے وقت آپ صف اوّل میں عین امام کے پیچھے نہ ہوں۔ خیر المدارس میں اذان ظہر جماعت سے نصف گھنٹہ قبل ہوتی تھی۔ ہمیشہ دیکھا گیا کہ اذان شروع ہونے سے قبل آپ مسجد میں، صف اول میں امام کے پیچھے اپنی جگہ پر پہنچے ہوتے تھے۔ جماعت کھڑی ہونے تک تلاوت میں مشغول رہتے۔

اپنے محلے کی مسجد کی امامت نہیں تھی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے جاتے تھے۔ مسجد والوں نے فجر کی نماز ذمے لگا رکھی تھی۔ حضرت خود پڑھاتے، طویل تلاوت فرماتے تھے۔

تراویح میں قرآن پاک ہمیشہ سنایا۔ آخر میں شوگر کی شدت اور ضعف کی وجہ سے مسجد میں تراویح کی امامت ترک فرمادی تھی۔ لیکن صبح تہجد میں چار رکعت میں پانچ پارے پابندی سے سناتے تھے۔ اس کے علاوہ رمضان المبارک میں یومیہ تقریباً 15 پارے منزل تلاوت فرماتے تھے۔

باوجود تدریس وغیرہ کی مشغولیت کے رمضان المبارک میں حضرت کی درسگاہ مستقل طور پر مسجد سراجاں میں ہی ہوتی تھی۔ تمام طلبا کی سحری، افطاری کا بہترین اور پرتکلف انتظام خود حضرت اپنی ذمہ داری پر فرماتے تھے۔

تعلیم میں مصروف رہتے۔ رہائشی فارغ التحصیل شاگرد بھی کافی تعداد میں آ جاتے۔ شہر کے وسط میں قرآن پاک کے اور رمضان المبارک کے انوارات و برکات سے پورا ماحول بقعۂ نور بنا ہوتا، جس کی چاشنی، لذت و سکون ابھی تک قلب و جگر اور جسم کے انگ انگ میں رچا بسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

وصیت نامہ:

یہ ستمبر 1982ء کی بات ہے۔ حضرت کے انتقال کے بعد ہمیں ان کا ایک وصیت نامہ ملا۔ اس میں ایک وصیت یہ بھی درج تھی۔ حضرتؒ نے لکھا تھا:

''میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ میری طرف سے مدرسے کا کوئی حق ایسا نہ رہے، جو ادا نہ کیا ہو۔ مگر یہ ممکن ہے کہ میں درس گاہ میں بیٹھا ہوں اور کبھی میرا ذہن پوری طرح حاضر نہ ہو۔ میرے خیالات کہیں اور بھٹکتے رہے ہوں۔ لہٰذا میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری آمدنی میں سے دس ہزار روپے مدرسے میں جمع کروا دیے جائیں۔''

آپ سن 82ء کے دس ہزار کی ''ویلیو'' کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ تصور کیجیے! ایک ایسا شخص جس نے اپنا سب کچھ مدرسے کے لیے وقف اور طلبہ پر قربان کر دیا ہو۔ ایک مثال قائم کر دی ہو کہ حاضری کسے کہتے ہیں اور اپنے منصب کے ساتھ دیانت داری کی ایک تاریخ رقم کی ہو۔ اس کے باوجود بھی آخرت کی فکر غالب ہے کہ مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو گئی ہو۔ اس موہوم کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لیے وصیت کی کہ میری طرف سے 10 ہزار مدرسے میں جمع کرا دینا۔

ہم اُنھی کے نام لیوا ہیں۔ اپنی نسبت ان کی طرف کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ کبھی ہم تنہائی میں بیٹھ کر سوچ لیا کریں کہ ہم جن کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑتے ہیں، کیا ہماری حاضری کی صورت حال بھی ان جیسی ہے؟

☆☆☆

دوسرا باب

کامیاب مدرّسِ قرآن کے اوصاف

اخلاصِ نیت

ہمارے اکابر اس بات کی بطور خاص وصیت اور تلقین کرتے ہیں اور اس پر پوری طرح متوجہ کرتے ہیں کہ مدرس کو اپنی نیت کی اصلاح کرنی چاہیے۔ وہ یہ نیت کرے:

''اے اللہ! میں آپ ہی کی رضا کے لیے درسگاہ میں آیا ہوں۔ آپ کی رضا کی خاطر اپنی ذمہ داری نبھانے یہاں بیٹھا ہوں۔''

اس کے علاوہ جو چیزیں ہیں، جیسے: تنخواہ، عزت اور شہرت وغیرہ...... یہ سب ضمناً حاصل ہو جائیں گی۔ اگر ان چیزوں کو مقصد بنالیا کہ میں وہاں جاؤں گا تو مجھے اتنے اور اتنے ہزار تنخواہ ملے گی۔ مجھے ''قاری صاحب'' کہا جائے گا۔ شہرت بھی ملے گی۔ ان چیزوں میں سے کسی کو اس نے اپنی نیت کی بنیاد بنالیا تو سمجھ لو کہ اس کا پڑھنا، پڑھانا سب ضائع ہو گیا۔ اس لیے مدرسین کو سب سے پہلے اپنی نیت کی اصلاح کرنی چاہیے۔

صحیح بخاری شریف کی یہ سب سے پہلی حدیث یقیناً آپ سب حضرات نے سن رکھی ہو گی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ فرماتے ہیں:

سمعتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم يقول: إنّما الأعمالُ بالنيّاتِ، وإنّما لامرِئٍ [لكل امرئ] مّا نوٰى ...... " (صحيح البخاري: 1/1، الطاف سنز، کراچی)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔''

جب ایک مدرس مضبوط ارادے، درست نیت اور اخلاص کے ساتھ بیٹھے گا تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس کا اثر اس کے کام پر پڑے گا۔ وہ پوری ہمت اور دیانت داری کے ساتھ کام کرے گا۔ اس لیے کہ جب اس کا مقصد ہی اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس کے لیے پابندی کرنا اور

اس ماحول میں جتنی بھی خلاف طبیعت اور ناگوار باتیں پیش آئیں گی، ان کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس طرح اسے اپنے مقصد کے ساتھ ایک لگن پیدا ہو جائے گی۔

درست نیت انسان کے اندر ایک قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا جذبۂ عمل پیدا ہو جاتا ہے کہ دیگر ہر طرح کی باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں۔ حضرت اقدس حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جب ایک معلم کی نیت درست ہوگی تو بہت بعید ہے کہ وہ یہ نیت کرنے کے بعد اپنی درسگاہ میں کسی اور کام میں مصروف ہو۔''

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا واقعہ پیچھے گزرا ہے۔ جس کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ و مرشد سے کوئی ذکر تلقین کرنے کی درخواست کی تو حضرت رائے پوری رحمہ اللہ نے فرمایا: '' آپ کو ذکر کی ضرورت نہیں۔ آپ پہلے سے ہی بہترین ذکر میں صبح سے شام تک مصروف ہیں۔ آپ صرف یہ نیت کر لیا کریں کہ 'اے اللہ! آپ کی رضا کے لیے بیٹھا ہوں' اور اس نیت کا استحضار تعلیم کے دوران میں بھی رکھا کریں۔ بیٹھتے وقت پورے اہتمام کے ساتھ نیت کی تجدید کر لیا کریں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت کی درستگی، اس کا مسلسل استحضار اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید کرتے رہنا یہ انتہائی بنیادی اور اہم چیز ہے۔

نیت کر لینے کے بعد درسگاہ میں بیٹھ کر ایک مدرس کا اخلاقی لحاظ سے یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اور دل و دماغ کو پوری طرح حاضر رکھ کر بچوں کی خدمت کے لیے صرف کرے۔

☆☆☆

مستقل مزاجی

تدریس یا خانہ بدوشی؟

جو لوگ بار بار جگہ بدلتے ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ بتا نہیں سکتے کہ 20 سال پڑھانے کے باوجود کتنے بچوں نے ان سے حفظ کیا؟ وہ ایسے ہی اساتذہ ہوتے ہیں جو جم کر اور ڈٹ کر نہیں پڑھاتے۔ ایک سال کہیں، دوسرے سال کہیں تو تیسرے سال کہیں اور۔ ایسا استاد اپنی کوئی کارکردگی کسی کے سامنے واضح طور پر پیش نہیں کرسکتا، لہٰذا اپنے اندر پیدا کرنے کا ایک وصف ''استقامت'' بھی ہے۔ اسی کو عربی محاورے میں کہا جاتا ہے: "اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ اَلْفِ کَرَامَۃٍ" کہ ایک مستقل مزاجی ہزار کرامتوں پر بھاری ہے۔

اس کی ذرا وضاحت یہ ہے کہ مثلاً ایک عابد ہے۔ اس پر عبادت کا شوق غالب ہے۔ وہ پوری پوری رات نفلیں پڑھ رہا ہے۔ دو، چار، پانچ یا سات اسی طرح دن یہ چلتا رہا، اس کے بعد رک گیا۔ دوسرا شخص وہ ہے جو ساری رات سوتا ہے۔ فقط صبح تہجد میں اٹھتا ہے، صرف پندرہ منٹ ہی سہی، مگر اس پر دوام اختیار کرتا ہے۔ اس کا درجہ اس شخص سے بھاری ہے جو ساری ساری رات اپنے وقتی جذبے کے ساتھ کھڑا رہا، اس کے بعد اس میں کمی اور کمزوری آگئی۔

یہ پندرہ منٹ عبادت کرنے والا پہلے والے سے افضل اس لیے ہے کہ اس نے تھوڑا ہی سہی، مگر اسے مستقل بنیادوں پر کیا اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس لیے اپنے اندر استقامت پیدا کرو۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ. فَکَانَتْ عَائِشَۃُ اِذَا عَمِلَتْ، دَاوَمَتْ عَلَیْہِ." (الزھد والرقاق لابن المبارک رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: 468/1)

''اللہ کے ہاں محبوب عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ مقدار کے اعتبار سے کم ہو۔''

راوی فرماتے ہیں:اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمانے والی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بھی یہی معمول تھا۔ وہ جب کوئی نیک کام شروع فرمائیں تو پھر اس پر ہیشگی اختیار فرماتی تھیں۔"

مداومت اور میانہ روی کے ساتھ چلتے رہیں اور ہمیشہ چلتے رہیں، آپ بہترین کام کر سکیں گے۔ ہمارے مدرسین میں اسی وصف کی شدید کمی ہے۔ اگر انتظامیہ نے آپ کے لیے کوئی اجلاس بلا لیا، تربیتی نشست ہوگئی، جذبات پیدا ہوئے، آپ نے درسگاہوں میں جا کر بڑی شدت سے کام شروع کر دیا، لیکن دس پندرہ دن اس کا اثر رہا، اس کے بعد پھر ڈھیلے ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ظاہری طور پر اس مجلس کے تھوڑے بہت اثرات واقع ہوئے ہیں۔ اس کی طبیعت مستقل کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ اپنی طبیعت کو استقامت کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنایا جائے۔

پیچھے بتلایا گیا کہ حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کی ایک ہی مدرسے میں تدریس کا عرصہ 40 سال ہے۔ ہماری مستقل مزاجی کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ ایک سال کہیں تو اگلے سال اگلا مدرسہ۔ چل پھر کر خانہ بدوشوں جیسی ہماری تدریس ہے۔ انہوں نے استقامت کے ساتھ چالیس سال تک ایک ہی جگہ پڑھایا۔ یہ نہیں کہ ان کو کچھ واقعات اور حالات بھی پیش نہ آئے ہوں۔ ایسے متعدد حالات پیش آئے جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹانے کے لیے کافی تھے۔ جن کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔ تاہم ان تمام حالات کے باوجود اپنی ذمہ داری کو چالیس سال تک انہوں نے پوری دیانت، جانفشانی اور وفاداری کے ساتھ وقت نبھایا اور خوب محنت کے ساتھ پڑھایا۔ اس لیے مدرس کو حتی الامکان یہی کوشش کرنی چاہیے کہ ایک جگہ پڑھائے اور جم کر پڑھائے۔

استقامت ہو تو ایسی:

مدرسے کے ساتھ تعلق، مدرسے کے مہتمم کے ساتھ محبت اور معاملات میں استقامت کی شاندار مثال ان حضرات کے دنیا سے جانے کے بعد، آنے والوں کے لیے ہمیشہ موجود رہے

گی۔کسی نے اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو خیر المدارس کے اس قطعۂ نور میں جائے، جہاں ہمارے بڑے آرام فرما رہے ہیں۔ ہر جانے والا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے گا کہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جانب حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ مہتمم مدرسہ محمدیہ آرام فرما رہے ہیں تو دوسری جانب حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ مہتمم جامعہ خیر المدارس آسودۂ خاک ہیں۔

حضرت قاری صاحب نے ہر طرح کے حالات میں اپنی زندگی میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور مرنے کے بعد بھی ان دونوں حضرات کے درمیان جگہ پائی۔ قیام پاکستان سے پہلے تدریس کے ابتدائی زمانے میں حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے ماتحت کام کیا اور قیام پاکستان کے بعد خیر المدارس میں، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کے دور میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ بعض دفعہ اپنے ان متعلقین کو جن کو دوران تدریس اپنے مہتمم سے شکوہ شکایت ہوتا اور یہ نزاع کی صورت اختیار کر جاتا، ان کو سمجھاتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے تھے:

’’تم کیسے مدرّس ہو، اپنے محسن کے ساتھ لڑتے ہو۔ مہتمم تو تمہارا محسن ہے کہ اس نے تمہیں ہر طرح کی معاشی فکر سے آزاد کر کے دین کی اور قرآن پاک کی خدمت میں مصروف ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔ تمہاری معاش کے ہر طرح کے تفکرات اپنے سر لے لیے۔ ایسے محسن کی تو ہر صورت میں قدر کرنی چاہیے نہ کہ شکوہ شکایت اور لڑائی جھگڑا۔ اور نہ ہی ان سے علیحدہ ہونے کا تقاضا نہیں ہونا چاہیے۔

پھر فرماتے کہ میری زندگی تمہارے سامنے ہے کہ کیسے بھی حالات آئے، مدرسے یا مہتمم سے علیحدہ ہونے کا سوچا بھی نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یکے بعد دیگرے مدرسے کے مہتمم حضرات ہی مجھے داغ مفارقت دیتے رہے۔ پہلے میرے مہتمم مولانا محمد علی جالندھریؒ بنے۔ انہوں نے اہتمام سمیت مجھے بھی مولانا خیر محمد صاحب کے سپرد کیا۔ پھر میرے مہتمم مولانا خیر محمد بنے۔ وہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئے۔ پھر مولانا محمد شریف صاحبؒ (قاری حنیف جالندھری صاحب، ناظم اعلیٰ: وفاق المدارس کے والد محترم) کا 1981ء میں مکہ مکرمہ میں انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ کے قبرستان میں مدفون ہیں، میرے مہتمم بنے۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چل بسے۔‘‘

مولانا محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ نے مولانا قاری محمد حنیف صاحب کے باوجود انتہائی کم عمر ہونے کے، نہ صرف ان کے اہتمام کو تسلیم کیا، بلکہ ان کے مہتمم بنانے میں کردار بھی ادا فرمایا اور زندگی کے آخری سانس تک انہی کے زیرِ اہتمام تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

اس ہونہار، فرزندِ لائق وفائق، رئیس جامعہ خیر المدارس نے حضرت قاری صاحبؒ کے لیے جامعہ خیر المدارس میں اپنے آبائی اور خاندانی قبرستان میں تدفین کا فیصلہ فرمایا۔ حضرتؒ کی رحلت کے آخری لمحات میں اکثر اعزا اور بہت سے متعلقین ہسپتال میں موقع پر ہی موجود تھے۔ انتقال کی خبر سنتے ہی حضرت مہتمم صاحب (مولانا محمد حنیف صاحب جالندھری) بھی فوراً ہسپتال پہنچ گئے۔ حضرتؒ کی میت کو گھر لے جانے سے پہلے ہی ہسپتال کے ایک کمرے میں اجلاس ہوا، جس میں تمام امور طے کیے گئے کہ جنازہ گھر سے کس وقت اٹھایا جائے گا؟ نماز جنازہ کہاں اور کس وقت ادا کی جائے گی؟ اور دفن کے متعلق بھی حضرت مہتمم صاحب کی ذاتی رائے تو خیر المدارس میں ہی اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کی تھی۔ مزید انہوں نے خاندان کے دوسرے معتبر حضرات سے مشاورت کے بعد باقاعدہ خیر المدارس میں واقع اپنے ذاتی خاندانی قبرستان میں دفن کا فیصلہ صادر فرمایا۔ یہ تمام امور طے پا جانے کے بعد حضرت کی میت کو گھر روانہ کر دیا گیا۔

تو یہ مختصر سی داستان ہے ''وفا، استقامت اور مستقل مزاجی'' کی! اور زندہ جاوید مثال ہے تا زندگی ایک ہی جگہ پر رہ کر کام کرنے کی! اللہ تعالیٰ اس وصف کا کوئی ذرہ ہمیں بھی نصیب فرما دے، آمین۔

☆☆☆

اپنے اساتذہ سے تعلق اور ان کی خدمت

ترقی کا راز:

کبھی سوچا آپ نے کہ ہمارے جن اکابر کے کاموں میں بے شمار برکات، ترقیات اور وسعتیں عطا ہوئی ہیں، ان کے شاگرد اِن پر مر مٹنے کو تڑپتے ہیں۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ ہم جب اپنے بڑوں کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس کی واحد وجہ ان کا اپنے اساتذہ کرام سے والہانہ تعلق، دل کی گہرائیوں سے ان پر فدا ہونے کا جذبہ اور بے لوث خدمت تھی۔

درس گاہ کی ترقی میں ظاہری اصول وضوابط کے ساتھ ساتھ اس چیز کا بے حد دخل ہے۔ یہ چیز ایک مخفی تاثیر رکھتی ہے۔ یہ محنت سے ماورا کوئی چیز ہے۔ درحقیقت اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے اصل چیز ہی یہی ہے۔ یہی اصل سرمایہ ہے۔ اگر اس تعلق کی بنیاد اخلاص پر استوار ہو تو... تجربہ شاہد ہے... ایسے مدرس کے کام میں ہمیشہ نکھار ہوگا۔ ترقی، برکت اور وسعت ہوگی۔ تھوڑی سی محنت کرے گا تو وہ بہت ابھر کر سامنے آئی گے۔

آج ہم میں سے اکثر کا تعلق اپنے اساتذہ سے کٹا ہوا ہے۔ اگر ہے تو مخلصانہ نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے بجلی سے چلنے والی تمام چیزیں ایک ''پاور ہاؤس'' سے جڑی ہوتی ہیں۔ جب تک یہ اشیا بجلی گھر سے منسلک ہیں، روشن ہیں۔ جونہی ان کا ناتہ منقطع ہوگا، تاریکی چھا جائے گی۔ آپ کی طرف بھی روحانی فیضان اپنے استادوں سے آ رہا ہے۔

اگر تعلق نہ رہے گا تو یہاں درسگاہ میں کہاں سے لائن آئے گی۔ پھر برکت، وسعت اور نکھار کی روشنی نہ آسکے گی۔ یہ روحانی تعلق پورے اخلاص کے ساتھ قائم ہے تو آپ کی درسگاہ میں اس کی روشنی اور اس کی قوت پوری طرح واضح ہوگی اور اگر پیچھے سے ہی تعلق منقطع ہے تو

یہاں بھی اندھیرا چھایا رہے گا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول:

میں نے ہمیشہ حضرت قاری صاحبؒ کو دیکھا، انہوں نے اپنے استاد کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنائے رکھا۔ پھر آخر عمر میں جب حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمہ اللہ کو فالج ہو گیا تھا، وہ کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارے حضرت اپنے بیمار استاد کی تیمارداری کے لیے جمعرات کو چھٹی کر کے شام کی ٹرین سے سوار ہوتے اور جمعہ کو صبح ہی کراچی پہنچتے۔ سارا دن استاد کی خدمت میں حاضر رہ کر رات کو ٹرین پر سوار ہوتے اور ہفتے کی صبح درسگاہ میں حاضر ہوتے۔ کیا آج ہمارا بھی اپنے اساتذہ سے ایسا تعلق ہے؟

ہم نے حضرت قاری صاحبؒ کو ہمیشہ ایسا کرتے دیکھا کہ قربانی کا موقع آتا تو جہاں آپ اپنی طرف سے قربانی کرتے، بڑے حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ کی طرف سے بھی قربانی کی جاتی، استانی محترمہ کی جانب سے بھی قربانی ہوتی۔ امام دانیؒ جو فن قراءت کے امام ہیں، ان کی طرف سے بھی قربانی کرتے۔ ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر سال چند نام منتخب کر کے ان کی طرف سے بھی قربانی فرماتے۔ پھر کیوں نہ اُن کے فیوض و برکات اِدھر منتقل ہوتے۔ میرا بھی الحمدللہ! ہر سال یہی معمول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بلا ناغہ قربانی کرتا ہوں۔ نیز اہل بیت اطہارؓ، صحابہ کرامؓ اور انتقال فرما جانے والے اساتذہ میں سے حضرت قاری صاحبؒ اور دیگر اساتذہ میں سے چند اسمائے گرامی منتخب کر کے ان کی طرف سے قربانی... اپنی قربانی کے بعد... ضرور کرتا ہوں۔

تعلق قائم رکھنے کی صورتیں:

☆......اگر اساتذہ کرام حیات ہوں تو آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان سے دعا کی درخواست کریں۔ بتلائیں کہ استاذ جی! میں فلاں جگہ پڑھا رہا ہوں۔ فلاں کام میرے ذمے ہے۔ کمزور ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ کی دعا سے اللہ تعالیٰ ترقی عطا فرمائیں

گے۔آپ میرے لیے ضرور دعا فرما دیں۔ استاد کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کی درخواست بھی کرتا رہے کہ تعلیم کے دوران مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئیں اور پھر اپنی کوتاہیوں کا ذکر بھی کرے کہ یہ، یہ کوتاہیاں مجھ سے ہوئیں۔آپ مجھے اللہ کے لیے معاف فرمادیں تاکہ میری درسگاہ میں برکت ہو۔

☆......استاد اگر دور ہیں تو خط وکتابت کا سلسلہ ان سے جاری رکھ کر دعاؤں کی درخواست کرتا اور کبھی حاضری بھی دیتا رہے۔

☆......اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں تو ان کی خدمت میں کچھ نہ کچھ ہدیہ پیش کرتا رہا کرے۔

ہمارے جامعہ کا نظم:

ہمارے ہاں (جامعہ دارالقرآن، فیصل آباد میں) معمول ہے کہ ہر روز ایک وقت میں سارے بچے سورہ یٰس کی تلاوت کرتے ہیں۔ ہمارا یہ معمول ظہر کے متصل بعد کا ہے۔اس وقت سارے طلبا شعبہ حفظ، شعبہ کتب اور شعبہ قراءت والے جمع ہوتے ہیں۔اس کے بعد چند اکابر اساتذہ کا نام لے کر، نیز سلسلے کے تمام بزرگوں کے لیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اپنے موجودہ اساتذہ تک، جن کے طفیل ہمیں قرآن پاک کی یہ دولت نصیب ہوئی ہے، سب کے ایصال ثواب کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے۔اس عمل کی برکات کا ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ایسی ہی چیزوں سے درسگاہ میں برکت اور رونق آتی ہے۔

آپ چاہیں یا نہ چاہیں:

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ آپ اور ہم جو کچھ پڑھا رہے ہیں، ہم ایک حرف کسی کو پڑھائیں گے، اس کا ثواب خود بخود ہمارے اساتذہ کو پہنچے گا۔ہم نیت نہ بھی کریں پھر بھی اس کا ثواب ان کو پہنچے گا، یعنی ہم اگر کسی استاد سے زیادہ ہی ناراض ہوں اور ہم نیت کرلیں کہ یا اللہ! اس کا ثواب ان کو نہ پہنچے، تب بھی ان کو پہنچ کر رہے گا۔ یہ تو ان کو اپنی محنت کا صلہ مل رہا ہے۔لیکن ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں فائدہ اس صورت میں ہوگا، جب ہم بالقصد اور بالارادہ اخلاص اور محبت کے ساتھ اور پوری ایک ترتیب قائم کر کے ان کے لیے ایصال ثواب کریں

گے۔ہم یہ نیت کریں کہ "اے اللہ! جو کچھ میں پڑھا رہا ہوں، جن اساتذہ کے طفیل مجھے یہ نعمت ملی ہے، میرے پڑھانے کا ثواب ان کو پہنچا اور ان کے لیے مجھے صدقہ جاریہ بنا!

ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ پڑھانے میں برکت عطا فرمائیں گے۔

ایک خطرناک کوتاہی:

ایک سب سے بڑی بیماری آج کے مدرّسین میں یہ ملتی ہے کہ اگر اس کے کئی اساتذہ ہیں، کچھ تو وہ ہیں جن سے اس نے شروع میں ناظرہ قرآن پاک پڑھا۔ کئی وہ ہیں جن سے حفظ کیا۔ بعض وہ ہیں جن سے ابتدائی چند کتابیں پڑھیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے پاس اس نے دورہ حدیث کرلیا.... دیکھا یہ جاتا ہے کہ جو اساتذہ تدریس کرتے کرتے دورہ حدیث کی جماعت تک پہنچ جاتے ہیں یا دیگر بڑے مناصب کے مالک ہو جاتے ہیں، ہمارا تعلق صرف انہی کے ساتھ خاص ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی یہ وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ ہمارے ایسے بھی استاد ہیں جنہوں نے شروع میں ہماری انگلی پکڑ کر ان اداروں کا رخ کرایا تھا۔ چنانچہ میں اپنے طلبہ کو بھی یہ تلقین کیا کرتا ہوں اور اساتذہ سے بھی یہ درخواست کیا کرتا ہوں کہ اپنے کام میں برکت، رونق اور ترقی چاہتے ہو تو ان اساتذہ کو خاص طور پر ملنے جایا کرو جو آپ کے بالکل ابتدائی اساتذہ ہیں، جنہوں نے آپ کو نورانی قاعدہ پڑھایا ہے، جنہوں نے آپ کو ناظرہ قرآن پاک پڑھایا، جن کے پاس آپ نے چند سپارے حفظ کیے۔

اس لیے کہ بڑوں کو تو ہر کوئی ملنے جاتا ہی ہے۔ کسی استاد کو چھوٹا سمجھنے سے ہمیشہ بچتے، بلکہ ڈرتے رہو کہ اس کے شدید نقصانات ہیں۔ شیطان یہ وسوسے ذہن میں ڈالتا رہتا ہے کہ بھئی! وہ تو ابتدائی استاد ہیں، ان کو کیا ملنا؟ بڑوں سے تعلق رکھنے کے منافع تو سامنے نظر آتے ہیں، لیکن چھوٹے اساتذہ سے تعلق رکھنے میں جو فوائد ہیں، وہ مخفی مگر بہت قوی ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی استاد کو کبھی چھوٹا نہ سمجھیں۔

[ایک عجیب بات ملاحظہ فرمائیے کہ اپنے ایک بیان میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا تھا: جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا تھا اللہ تعالیٰ مجھ سے کسی کی غیبت کرنے پر

باز پرس نہ فرمائیں گے۔اسی طرح میں بھی کہتا ہوں اللہ مجھ سے میرے اساتذہ کے حوالے سے حساب نہ فرمائیں گے۔ان کی حقوق تلفی سے متعلق نہ ہی دل میں ان کی بے ادبی کا خیال لانے پر۔سبحان اللہ۔مرتب عفا اللہ عنہ]

عبرت آموز قصہ:

اس حوالے سے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن ..... صدر المدرسین، مظاہر العلوم.....نے اپنا واقعہ لکھا ہے۔وہ فرماتے ہیں: میں اپنے علاقے کی سطح کی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے غالباً دیوبند، بڑے اساتذہ کے پاس گیا۔ لکھتے ہیں کہ میں بڑے شوق کے ساتھ گیا تھا۔ بڑے جذبات کے ساتھ گیا تھا۔ جانے سے پہلے میں اکثر استادوں سے مل کر بھی گیا تھا۔ایسا نہ تھا کہ میرے والدین نے مجبور کر کے پڑھنے کے لیے بھیجا ہو، میں شوق سے پڑھنے کے لیے گیا تھا۔ میں غبی بھی نہ تھا، ذہین اور استعداد کا مالک تھا۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے تمام راستے بند نظر آ رہے ہیں۔طبیعت میں بے چینی ہے۔میں نے بڑا غور کیا، کئی دن تک سوچتا رہا۔ یہ جو میرے سامنے اندھیرا آیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ میرا یہ سب کچھ تاریک کیوں ہو گیا؟ کہتے ہیں، بہت کچھ سوچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی۔ میرا ذہن منتقل ہوا کہ جب میں اپنی جگہ سے چلا تھا، میں نے تمام مشہور اساتذہ سے تو مل لیا تھا، مگر میرے جو فلاں استاد تھے، میں ان سے مل کر نہیں آیا ہوں۔میرے دل نے بھی گواہی دی کہ یہی بات ہو سکتی ہے۔

چونکہ ان دنوں سفر کڑا اور آنا جانا بہت مشکل تھا۔فرماتے ہیں: میں نے اسی وقت ایک خط لیا اور جوابی لفافے کے ساتھ ان استاد صاحب کو لکھا کہ میں اس طرح وہاں سے آیا تھا۔سب سے مل کر آیا تھا، مگر میری کوتاہی کہ آپ سے نہ مل سکا۔ یہاں پر آ کر میری صورت حال یہ ہے کہ علم و عمل کے تمام راستے بند نظر آ رہے ہیں۔ یہ آفت اسی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔آپ خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیں۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔ میں جب بھی آؤں گا، سب سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔آپ مجھے معاف فرما دیں۔فرماتے ہیں: وہ خط لکھنے کے

بعد ہوسکتا ہے وہ خط ابھی پہنچا بھی نہ ہو، دل کی وہ کیفیت چھٹنا شروع ہوگئی۔ جو انتشار تھا، وہ ختم ہوگیا۔ اب دلجمعی پیدا ہوگئی۔ پڑھنے کی طرف رغبت پیدا ہوگئی۔ ماحول کے ساتھ مجھے انس پیدا ہوگیا اور کتاب مجھے سمجھ آنے لگی....

کچھ عرصے بعد ان استاد جی کا جوابی خط آیا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ " آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے بھی معلوم ہوا تھا کہ آپ فلاں جگہ پڑھنے کے لیے چلے گئے ہیں، لیکن آپ مجھے مل کر نہیں گئے تھے، میں نے سمجھا شاید مجھے چھوٹا سمجھ کر ملنے نہ آئے ہوں۔ لیکن اب میں پوری طرح آپ سے خوش ہوں، راضی ہوں۔ اس کے بعد دعائیں لکھیں کہ اللہ پاک آپ کو عالم باعمل بنائے اور آپ سے دین کی خدمت لے۔" (آداب المتعلمین: 31، مولانا سید صدیق احمد باندوی رحمہ اللہ)

یہ کونسی ایسی بات تھی؟ کسی استاد کی توہین نہیں کی تھی، کسی استاد کو گالی نہیں دی تھی، کسی استاد پر اعتراض نہیں کیا تھا، کسی پر تنقید نہیں کی تھی۔ ایک تھوڑی سی غفلت اور سستی یہ ہوئی کہ چلتے وقت ان استاد کو مل کر نہیں گئے۔ وہ اپنا مشاہدہ اور تجربہ پوری امت کو دے گئے ہیں کہ اس کے بھی کتنے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد حضرت شاہ عبدالرحمٰنؒ سے اللہ نے جو علمی خدمات لی ہیں، وہ رہتی دنیا تک کے لیے کارآمد ہیں۔

ذرا اس پر بھی غور کریں کہ کیا ہمارا اپنے اساتذہ کے ساتھ تعلق قائم ہے؟ اگر انہوں نے پڑھائی کے دوران کسی قسم کی کوئی سختی کی ہے، ہم نے ان کو دل سے معاف کرکے ان کے لیے تنقید کے راستے بند کردیے ہیں یا نہیں؟ ان کی عظمت ہمارے دل میں پہلے سے زیادہ ہے یا کم ہے؟ ان میں سے ہر ہر چیز کا اثر تعلیم پر ظاہر ہوتا ہے۔ عمل میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ درس گاہ میں بھی عیاں ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے بڑوں کے واقعات بھی سنے ہیں۔

اس موقع پر منتظمین سے درخواست کروں گا کہ ایسے اساتذہ جو ذاتی کوشش سے... چلتے پھرتے... تدریس کی تلاش میں آتے ہیں، ان کے بارے میں اس حوالے سے بھی تحقیق کرلیا کریں کہ ان کے اپنے اساتذہ سے روابط کیسے ہیں؟ کہاں سے پڑھا ہے؟ اس کا خصوصی تعلق

کس کے ساتھ ہے؟ اپنے اساتذہ سے اس کا تعلق کٹ تو نہیں چکا؟ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایسا استاد حقوق کی ادائیگی کی پوری کوشش کرے گا۔ وہ لگن اور استقامت کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہے گا۔ اس کا استاد وقتاً فوقتاً اسے تنبیہ کرتا رہے گا:

''ڈھنگ کا پڑھو اور پڑھاؤ! جگہ وغیرہ بدلنے میں تمہارا نقصان ہے، کوئی فائدہ نہیں! وغیرہ۔''

محاسبے کا اہتمام

ہمارے حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نصیحت یہ فرمایا کرتے تھے:
''ضروری نہیں کہ سال کے بعد ہی حساب کرنا ہے۔ تاجر اپنے حساب کو سال پر نہیں رکھتا، بلکہ وہ ہر شام کو حساب کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسا نظام ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ روز کا حساب روز ہی چکا دیتا ہے۔ اسی چیز کو وہ اپنی کامیابی کا راز سمجھتا ہے۔ آج دن میں کس قدر فروخت ہوئی ہے؟ کتنا پیسہ آیا اور کتنا خرچ ہوا؟
لہٰذا جب آپ رات کو سونے کے لیے لیٹیں تو مراقبے کا خصوصی اہتمام کریں۔ یہ بہترین وقت ہوتا ہے، تنہائی ہوتی ہے، یکسوئی ہوتی ہے۔ اس وقت آپ دن بھر کے تمام کام اور آج کا دن جیسا گزرا ہے..... اس کو آپ اپنے ذہن میں لانا شروع کریں۔ سوچیں کہ آج میں وقت پر درس گاہ گیا تھا یا نہیں؟ اگر گیا تو اچھی بات ہے، تاخیر سے پہنچا تو اس پر اپنے آپ سے گرفت کرے کہ مجھ سے آج سب سے پہلی اور بہت بڑی غلطی یہ ہوئی ہے۔ اس پر وہیں لیٹے لیٹے استغفار کرے، نیز اللہ تعالیٰ سے عہد کرے کہ ان شاء اللہ! آئندہ میں درسگاہ میں وقت پر جاؤں گا۔ اس کے بعد اور آگے بڑھیں۔ پھر سوچیں کہ آج میری درسگاہ میں کتنے بچوں نے سبق نہیں سنایا؟ اس مقصد کے لیے آپ مختلف جائزہ فارم تیار کر سکتے ہیں۔ انتظامی لحاظ سے آپ کوئی بھی ترتیب بنا سکتے ہیں۔ آپ خود احتسابی کے ذریعے اصلاح اور ترقی کے راستے پر گامزن رہیں گے۔

یہاں ایک بات منتظمین کو خبردار کرنے لیے عرض کرتا ہوں کہ بعض مدرسین اپنے منتظمین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کتنی مہارت سے کام لیتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں..... ایک ناظم جتنے بھی بڑے نظام بنا لے، کاپیاں بنا لے، انہوں نے اپنا کام کر دکھانا ہے۔ جس طرح

ہمارے ہاں ٹیکسوں کا نظام چل رہا ہے، گورنمنٹ کوئی قانون بناتی ہے۔ تاجر اس کا توڑ نکال لیتا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں نہایت مستعدی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

تاہم مدرسین ذہن میں رکھیں کہ یہ تو سراسر آپ کا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے۔ آپ کی نیت کی اصلاح ہوگئی تو آپ سوچیں گے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پڑھانا ہے، پھر آپ کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ مجھے کون دیکھ رہا ہے؟ مجھے کون پوچھنے والا ہے؟ آپ سارا دن اپنے کام میں مگن رہیں گے۔

پھر یہ محاسبہ کریں آج کتنے بچے ایسے ہیں جن کا میں نے سبق نہیں سنا؟ حساب کتاب کا یہ ایسا کمپیوٹر اللہ نے آپ کو دیا ہوا ہے جسے آپ کو خریدنے کی ضرورت نہیں، اللہ نے مفت میں آپ کو عطا کیا ہے۔ آپ کو اللہ نے ایک مفت میں جج بھی عطا کیا ہوا ہے، جو فیصلہ کرتا ہے کہ تیرا یہ کام غلط ہوا ہے اور یہ کام صحیح ہوا ہے۔ کوئی کام بھی آپ اپنے دل پر پیش کریں، وہ آپ کو فوراً فیصلہ کر کے دے گا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ آپ کو کسی کے پاس فتویٰ لینے جانے کی ضرورت ہی نہیں۔

بہرکیف! مراقبہ اسی چیز کا نام ہے۔ یہ جو بزرگ اور شیوخ مراقبہ کراتے ہیں، وہ اسی چیز کا کراتے ہیں۔ وہ رات دن کے تمام کاموں کو رات کو بیٹھ کر سوچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آج میرا پاؤں کس طرف چلا، کس نیت سے چلا؟ آج میرا ہاتھ کس طرف بڑھا، کس نیت سے بڑھا؟ آج میری آنکھ کدھر استعمال ہوئی، کس نیت سے استعمال ہوئی؟ آج میرے کانوں نے کیا سنا، غلط تھا یا صحیح؟ آج میرے دل میں کیا کیا تفکرات آئے؟ میری سوچ کا محور آج کیا رہا ہے؟ آپ اپنی زندگی کو اس پر لے آئیں۔ اسی بات کی نصیحت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے: "حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا"، "اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، تمہارا حساب کیا جائے، خود ہی اپنا حساب کرو۔" پھر فرمایا: "فَاِنَّهٗ اَیْسَرُ بِحِسَابِكُم"، "اس سے خدا کے حضور حساب میں آسانی رہے گی۔" (الزهد والرقائق، لابن المبارك رحمه الله : 103/1، دار الكتب العلميه)

یہ خود احتسابی چاہے آپ کی درس گاہ سے متعلق ہو، نجی زندگی سے متعلق ہو یا مالی معاملات

سے متعلق ہو، آپ کا اللہ کے ساتھ جو تعلق ہے، اس کے بارے میں اپنا محاسبہ خود کریں۔ ان شاء اللہ! اللہ کی ذات سے امید ہے آپ کی دنیا بھی اچھی ہوگی اور آخرت بھی اچھی ہوگی اور ان شاء اللہ العزیز! عزت کے راستے تمہارے لیے کھلے ہوئے ہوں گے۔ جب آپ ان خطوط پر آجائیں گے، میں سمجھتا ہوں آپ کے اوپر جو نگران مقرر ہیں، کام دیکھنے والے یا دفتری کارروائی کے لیے جو رجسٹر بنے ہوئے ہیں، یہ سب کام ختم ہو جائے گا۔ آپ کے منتظمین بھی بے فکر ہو جائیں گے۔ ان کا کام بہت حد تک آسان ہو جائے گا۔

ہمارے پرانے بزرگ حضرات کے کام کی نگرانی کرنے کے لیے کوئی نظام نہیں تھا۔ وہ کس وقت آتے ہیں اور انہوں نے سارا دن کیا کیا ہے؟ کس کی منزل سنی، کس کا سبقی پارہ سنا، اس مقصد کے لیے ان کے اوپر کسی نگرانی کی ضرورت نہ تھی۔ ہر ایک مدرّس، کامل مدرس تھا۔ ان کو خود ہی ان سب چیزوں کی فکر ہوتی تھی۔ ان کے دل میں سچا درد اور حقیقی خوف خدا تھا۔ یہ بچے میرے پاس قوم کی امانت ہیں۔ اگر میں نے اس امانت میں خیانت کی تو میں ان کا بھی ذمہ دار ہوں اور اللہ کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔ ان کا ایک مشن تھا۔ اس عہد کے ساتھ اور اس جذبہ کے ساتھ وہ آگے بڑھتے رہے۔

منتظمین کی خدمت میں!

نفع ونقصان کا حساب رکھیں:

میں اپنے مدرسے کے مدرسین سے اکثر یہ بات کہا کرتا ہوں کہ ہم بڑے فخر کے ساتھ ہر سال یہ اعلان کرتے ہیں۔ اس سال ہمارے مدرسے سے اتنے بچے فارغ ہو رہے ہیں اور اس سال اتنے فارغ ہو رہے ہیں۔ فلاں شعبہ سے اتنے فارغ ہو رہے ہیں اور فلاں سے اتنے۔ میں کہتا ہوں، یہ تو اللہ کا انعام ہے، کرم ہے۔ اس پر تو اللہ کی ذات سے امید ہے ان شاء اللہ وہ ثواب دے گا، لیکن ہر مدرس ایک ایسی فہرست بھی بنا کر لائے جس میں ہر اس بچے کا نام لکھے جو اس کے پاس داخل ہوا، لیکن وہ اس کے ہاں تکمیل نہیں کر سکا۔ وہ درمیان میں چھوڑ کر چلا گیا، بلکہ ایک وقت میں تو میں نے اپنے ادارے کے اساتذہ کو اس چیز کا پابند کیا تھا کہ وہ ایسی فہرست بنا کر ڈیسک پر اپنے سامنے رکھیں۔

اس فہرست میں بچے کا نام، ولدیت، مکمل پتہ، مقیم ہے یا شہری اور کتنے سپارے پڑھ کر گیا؟ اور یہ کہ وہ کس وجہ سے چھوڑ گیا؟ ان وجوہات کی تفتیش منتظمین خود کریں، ورنہ استاد کبھی نہیں لکھے گا، کبھی نہیں بتائے گا۔ تحقیق کر کے لکھیں کہ فلاں بچہ اس وجہ سے گیا اور فلاں اس وجہ سے گیا۔ ایک فہرست انفرادی طور پر ہر جماعت کی بنے۔ پھر اس فہرست کو سلسلہ وار پورا سال لے کر چلا جائے۔ سال کے آخر میں تمام اساتذہ کی وہ فہرستیں اکٹھی کر کے اس کے مجموعے کا جائزہ لیا جائے کہ ایک سال میں کتنے بچے ایسے ہیں جو داخل ہوئے اور ناکام چلے گئے؟ ساتھ ہی اس کا تجزیہ بھی کریں کہ وہ کس وجہ سے گئے؟

میں مزید یہ بھی کہوں گا کہ ادارے والے بھی ایسی فہرستیں بنا کر رکھیں کہ کتنوں نے داخلہ لیا تھا؟ کتنے کامل ہو کر گئے؟ اور کتنے درمیان میں تعلیم چھوڑ کر چلے گئے؟ یہ خاکہ بھی بنائیں کہ کس

کس استاد سے کتنے بچے گئے؟ اس کے بعد اس بات کا نوٹس لیں کہ کس وجہ سے یہ بچے چلے گئے؟ مدرسے کی سطح پر بھی یہ ترتیب قائم ہونی چاہیے اور استاد کو اپنے طور پر بھی یہ نظم بنانا چاہیے۔ اس سے ہمیں محاسبہ کرنے میں مدد ملے گی۔ ہم صرف یہی نہ سوچتے رہ جائیں کہ اتنے بچے ہم سے فارغ التحصیل ہو گئے، بلکہ ہمیں ہر وقت اس مواخذے کا خوف بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟ یا کسی طالب علم نے اللہ کے حضور ہماری یہ شکایت کر دی کہ میری گمراہی میں، میرے فلاں استاد کا دخل ہے تو ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے؟

یہ صورت حال کس قدر سنگین ہے؟ کبھی کبھی بیٹھ کر اس پر غور کیا کریں۔ نامعلوم وہ یہاں سے متنفر ہو کر گمراہی کے کس گڑھے میں گرا ہے۔ اس کی وجہ سے آگے کتنوں کا ذہن یہ بنا کہ مدارس میں اپنے بچوں کو نہ بھیجیں، میں نے توبہ کر لی ہے۔ اس کی باتیں سن کر کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو مدارس میں اپنے بچوں کو بھیجنا پسند نہیں کریں گے۔ اس پر مسلسل غور کیا جائے کہ ہماری اس کوتاہی کا کتنا شدید نقصان سامنے آیا ہے۔ جب ایک مدرس کے دل میں درد ہو گا اور اپنے منصب کی لگن اس کے دل میں جاگزیں ہو گی تو انتظامیہ کی طرف سے ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مدرس خود اپنا محاسبہ کرے گا۔

بہر حال! اس چیز کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ اس بات کے اہتمام کو لازم پکڑا جائے۔ جو طلبہ آپ سے مکمل پڑھ کر فارغ ہو رہے ہیں، ان کی فہرست الگ بنا کر رکھیں اور جو تعلیم ادھوری چھوڑ کر کسی وجہ سے چلے گئے ہیں، ان کا رجسٹر علیحدہ بنائیں۔ اس کا موازنہ کریں، ان کو دیکھیں اور پھر نفع و نقصان کا حساب کریں۔ میں نے کتنا نفع کمایا ہے اور کتنا میرا نقصان ہوا ہے؟ یہ بھی بہت بڑی تجارت ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ تجارت صرف مال کی نہیں ہوتی، اعمال کی بھی بہت بڑی تجارت ہوتی ہے اور وہ یہی ہے جو آپ کر رہے ہیں۔

مشورے کا اہتمام کریں:

بہت سے مدارس میں جانا ہوتا ہے تو مدرسین، منتظمین اور مہتمم حضرات کی آپس کی رنجشیں

سننے کو ملتی ہیں۔اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں۔میرے خیال میں ایسا عموماً ان تین قسم کے افراد کا باہم مل بیٹھنے کی کمی کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔اگر ہر معاملے میں ایک دوسرے کی رائے سنی جائے۔رائے کا احترام پیش نظر رکھا جائے۔ہر ایک کو اس کا مقام اور عزت واحترام دیا جائے تو کبھی بھی ناگوار صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خصوصی وصف یہ بھی بیان فرمایا کہ ان کے تمام امور باہم مشورے سے طے پاتے ہیں۔فرمایا:"وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " [الشوریٰ:38] یہ نظم وضبط کی بہت بڑی پالیسی ہمیں عطا فرمادی گئی ہے۔اسی پر اسلامی مملکت کی بنیاد اٹھائی گئی ہے۔اگر حکومتیں اس ایک اصول پر چلتی رہی ہیں اور چل رہی ہیں تو ہمارا ایک مختصر سا مدرسہ کیوں ناکام ہے؟

باہمی مشاورت کے لیے ادارے کی سطح پر کوئی بھی ترتیب بنائی جاسکتی ہے۔ہفتہ واری مجلس رکھ لی جائے یا ماہانہ یا جو بھی کسی کے لیے موزوں ہو۔اس کی افادیت کے اثرات آپ ہر سطح پر محسوس کریں گے۔اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے کہ ہمارے جامعہ میں کبھی کوئی اختلاف یا جھگڑنے کی نوبت نہیں آئی۔شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے اساتذہ ہر ہفتے ایک بار ضرور سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔رمضان المبارک میں چونکہ کئی امور طے کرنے ہوتے ہیں۔بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ اساتذہ و منتظمین تراویح پڑھ کر بیٹھے اور سحری تک مختلف امور پر ان کی مشاورت چلتی رہی۔

ماتحتوں کے ساتھ رویہ کیسا ہو؟

لہجے میں کرختگی پن، تحکمانہ انداز اور بے لچک حکم دے کر سو فیصد نتیجے کی توقع رکھنا...یہ سلسلہ بھی ہماری ناچاقیوں کا ایک بڑا سبب ہے۔ان تمام باتوں سے بچتے ہوئے ماتحتوں سے کام لیا جائے۔ان کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی کی جائے۔اس سے ان کی آپ کے ساتھ عقیدت ومحبت میں ڈھیروں اضافہ ہوگا۔وہ خوشی سے سب کام بجالائیں گے۔ ادارہ اساتذہ کے حق میں نرمی اختیار کرنے کو لازم پکڑے۔کئی جگہوں سے متعلق سننے میں آیا کہ کسی استاد سے کوئی غلطی ہوگئی، کوئی زیادتی ہوگئی، ایسی صورت میں بعض دفعہ تو ادارے والے بھی انتہائی غیر

ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ سب کے سامنے ہی استاد کو ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ سخت قسم کا مواخذہ کرنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف اساتذہ کی جانب سے بھی نامناسب رویہ سامنے آتا ہے۔ اگر ان کے حق میں ذرا زیادتی ہوگئی یا ادارے والے نے تھوڑی سی سرزنش کر دی تو اس پر وہ کنکر کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ کوئی آتا ہے، آئے۔ نہیں آتا نہ آئے۔ کوئی سناتا ہے، سنائے۔ نہیں سناتا نہ سنائے۔ بس بیٹھے ہیں۔ کیوں جی؟ کہتے ہیں ادارے والوں نے کہا ہے: ''سختی نہ کرو۔'' اب سختی نہ کرنے کا مطلب انہوں نے یہ لے لیا کہ کچھ ہوتا ہے ہو، نہیں ہوتا نہ ہو، بس وقت پورا کرنا ہے اور اس کے بعد چلے جانا ہے۔ یہ بھی استاد کی پرلے درجے کی غیر ذمہ داری والی بات ہے۔

بہرحال! ہر دو صورت میں اعتدال کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے تدریس قرآن پاک کی خدمت سرانجام دینے کی ضرورت ہے۔

علم کی کمی کو پورا کرنا

حفظ کے مدرسین میں عموماً سادہ حافظ ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں، جو مکمل عالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ علمائے کرام کو بھی اس عظیم شعبے میں لگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بہر حال! ایسی صورت میں حفاظ مدرسین کا قرآن پاک کے حوالے سے ضروری مسائل جاننا اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے جائز و ناجائز اور حلال و حرام سے متعلقہ مسائل سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ صرف سنی سنائی معلومات پر قناعت کرنا اور بس مدرّسِ قرآن ہونے پر اکتفا کر کے بیٹھے رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ایسے حضرات اپنی اس کمی کی تلافی بھی مناسب طریقے اپنا کر کر سکتے ہیں۔ تین باتیں بطور مشورہ پیش خدمت ہیں:

❀..... ایک یہ کہ اپنی تدریسی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد مدرسین کے پاس دن کے 3، 4 گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ وقت بچ رہتا ہے۔ ان کا یہ وقت کس مصرف میں استعمال ہوتا ہے؟ یہ اوقات مختلف بے کار مشغولیات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ دوستیاں اور تعلقات قائم کرنے اور ان کو نبھانے کی فکر میں صرف ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار خرافات آج کل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ لہٰذا ان اوقات کے لیے کوئی نہایت مفید مصرف ہونا چاہیے، مثلاً: جس ادارے میں پڑھا رہے ہیں، وہیں پر کوئی کلاس ایسی شروع کی جائے، جس میں ان کے لیے کچھ تجوید، کچھ ترجمہ و تفسیر اور کچھ مسائل وغیرہ ترتیب دے کر ایک کورس تشکیل دے لیا جائے۔ اس سے ان کو جائز و ناجائز، حلال و حرام اور دینی تعلیم کا کافی حصہ حاصل ہو جائے گا۔

❀......اگر انتظامیہ کے لیے یہ مشکل ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے مختلف قسم کے کورس مساجد میں شروع ہیں۔ مغرب سے عشا تک، بعض عصر کے بعد، بعض عشا کے بعد [illegible] کے پاس علم کا ایک ذخیرہ جمع ہو جائے

گا۔علم کے اپنے انوارات ہوتے ہیں۔اس کے بعد اپنی زندگی کا رخ پلٹنے میں آپ کو مدد ملے گی۔

❁ تیسری صورت سب سے آسان اور ہر حال میں مفید ہے۔اسے غذا کی طرح اپنی عادت بنا لینے کی ضرورت ہے۔وہ یہ ہے کہ کتابوں سے اپنا تعلق قائم کرلیں۔ذاتی دلچسپی سے کام لے کر ایسی مفید کتب کو خود بخود مطالعہ کریں جو آپ کی علم و معلومات کی کمی کو پورا کریں۔مثال کے طور پر ہمارے اسلاف کی زندگیوں پر بے شمار سوانح لکھی گئی ہیں،ان کو اپنے مطالعے میں رکھیں۔جب آپ بزرگوں کے حالات پڑھیں گے ان شاء اللہ کام سے رغبت رہے گی،دل میں تقویت پیدا ہوگی اور اعمال میں پختگی آئے گی۔یہ بھی سامنے آئے گا کہ ہمارے ان حضرات نے کیسے کیسے حالات سے گزر کر دین کی خدمت کی ہے۔

حضرت قاری رحیم بخش صاحب کی ایک کتاب ''آداب تلاوت'' ہے،جس میں انہوں نے دیگر بہت سی چیزوں کے علاوہ مدرسین کے حوالے سے درج کیا ہے کہ ان میں کیا اوصاف ہونے چاہییں اور کن باتوں سے ان کو بچنا چاہیے۔نیز قراءت پڑھانے کا طریقہ وغیرہ بھی درج ہے۔اسی طرح ایک کتاب "آداب المعلمین" ہے۔حضرت مولانا صدیق احمد باندوی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔اس میں معلمین کے لیے بہت ساری ہدایات ہیں۔ان کتابوں کا مطالعہ آپ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ان سب سے بڑھ کر حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فضائلِ اعمال'' ہے۔اس کو تو آپ لازماً مطالعے میں رکھیں۔اس میں نماز،درود شریف اور ذکر وغیرہ کے بہت سے فضائل مذکور ہیں۔یہ مت سوچیے کہ یہ تو تبلیغی جماعت کے لوگوں کی ہے۔ہمارا اس سے کیا تعلق؟

اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی ''آپ بیتی'' ہے۔اسے پڑھیے۔آپ کے لیے،آپ کے ادارے کے لیے اور آپ کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید ہے۔خود لیں اور مطالعہ کریں۔بہت سے جواہر آپ کے ہاتھ آئیں گے۔اس کے ساتھ اگر آپ اپنا مطالعہ مزید وسیع کرنا چاہیں تو ''بہشتی زیور'' پڑھیں۔آپ بڑے عالم اور فقیہ

ہو جائیں گے۔ نیز ''اکابر کا تقویٰ'' اور ''فضائل صدقات'' نامی کتابیں بھی بہت مفید ہیں۔ بالکل آسان انداز میں مسائل سمجھنا چاہیں تو مشہور کتاب ''تعلیم الاسلام'' بہت مفید رہے گی۔ان تمام کتب کو اپنے مطالعے میں رکھیں۔

یہ اس لیے عرض کیا کہ آپ کے پاس جتنا وقت ہوتا ہے،ان اوقات میں سے صرف ایک گھنٹہ بھی آپ کتاب کے مطالعے کے لیے وقف کر دیں تو آپ اپنی جگہ رہتے ہوئے بڑے عالم بن جائیں گے۔ عالم صرف اس کا نام نہیں کہ وہ باقاعدہ درس نظامی پڑھا ہوا ہو۔اصل یہ ہے کہ جو کچھ علم میں آتا جائے،زندگی کا جزو بنتا جائے۔ بسا اوقات درس نظامی مکمل کر کے بھی اس کا کوئی اثر عمل میں نمایاں نہیں ہوتا۔ایسا شخص اصطلاحی عالم تو بن گیا ہے،مگر اس کا درجہ اس شخص سے کم ہے جو تھوڑا علم رکھتا ہے لیکن اس پر عمل کرتا ہے۔ جتنا علم آپ ان کتب میں سے سیکھ لیں،اللہ اس پر عمل کی بھی توفیق عطا کر دے تو یہ آپ کے پاس بہت بڑا خزانہ ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن کو آپ اگرچہ زیادہ وقت نہ دیں،صرف 15 یا 20 منٹ مطالعے کے لیے نکالیں،مگر مسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ... یہ آپ کی ضرورت کے لیے کافی وافی ہوں گے۔یہ پڑھ کر آپ کو بزرگوں کے حالات معلوم ہوں گے۔زندگی گزارنے کا طریقہ آئے گا۔ اس دور کے بہت سے فتنوں سے ان شاء اللہ بچے رہیں گے۔ ہمارے دلوں کی حالت بڑی تیزی اور آسانی سے بدل جائے گی۔اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے ہمیں ایک بالکل سیدھا راستہ عنایت فرمائیں گے۔

یہ تمام کتابیں تو ہر مدرس کے سرہانے رکھی ہونی چاہییں۔ جب وہ اکیلا ہو تو کچھ سوچنے کے بجائے،ان میں سے جس کتاب کے لیے اس کا جی چاہ رہا ہو،اس کو کھولے،دیکھے،مطالعہ کرے اور سو جائے۔بغیر کسی خاص مشقت کے مفت میں آپ کو بہت سا علم حاصل ہو جائے گا۔

☆☆☆

نوافل کا اہتمام کرنا

ایک جگہ امتحان لینے کا موقع ملا۔ ایک بچے سے پوچھا: مغرب کی رکعتیں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: پانچ۔ میں نے کہا: پانچ تو نہیں، ذرا سوچ کر بتاؤ۔ اس نے (سوچ کر) جواب دیا: پانچ ہی ہیں۔ بھلا کون سی؟ تین فرض اور دو سنت! اس سے پوچھا گیا: رکعتیں تو سات ہیں، پانچ کے ساتھ دو اور بھی ہیں، مگر آپ پانچ کیوں بتاتے ہیں؟ وہ کہتا ہے، جی! میں نے اپنے استاد کو ہمیشہ پانچ ہی پڑھتے دیکھا ہے۔

اس بچے نے سچ ہی کہا تھا۔ آج ہماری زندگی سے نوافل بالکل نکل گئے ہیں۔ جو نوافل فرض نمازوں سے ہٹ کر ہیں، ان کا تو خیر سوال ہی نہیں، جو فرض نمازوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں وہ بھی ہماری زندگی سے بالکل خارج ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر نوافل آپ کے معمولات کا حصہ نہ رہے تو یہ سلسلہ آگے سے آگے ہی بڑھے گا۔ پھر نہیں معلوم کہ اور کیا کیا ہم سے چھوٹتا چلا جائے۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ جس کے دل سے نوافل کا اہتمام نکل جاتا ہے، سنتوں کی قدر بھی اس کے دل میں نہیں رہتی۔ پھر جو سنت چھوڑ دیتا ہے، فرض چھوڑنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہتا۔

فرضوں کا اہتمام جس کی زندگی سے نکل گیا، وہ تباہی کے گڑھے میں گرنے کے لیے بالکل کنارے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کا گڑھے میں گر جانا یقینی ہے۔ اس لیے اگر ہم فرائض کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو سنتوں کا اہتمام کریں۔ سنتوں کو برقرار رکھنے کے لیے نوافل کو کبھی نہ چھوڑنا چاہیے۔ اگر ہم اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو بھی نوافل کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ اپنے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی سنیے، فرمایا:

أشرافُ أمّتِي حَمَلةُ القرآنِ و أصحابُ اللّيلِ. (الترغيب و الترهيب: 243/1،

دار الکتب العلمیة، بیروت)

''میری امت کے معزز لوگ اور اس امت کے شرفا قرآن والے ہیں۔ حاملین قرآن ہیں۔'' لیکن اس سے بھی زیادہ قابل غور بات اس سے اگلے الفاظ میں ہے۔

فرمایا: ''وَاَصْحَابُ اللَّيْلِ.''

یعنی ''رات کو اٹھنے والے۔'' ہم حاملینِ قرآن ذرا غور کریں، کیا ہم میں بھی کوئی صاحب اللیل ہے؟ رات کو اٹھ کر اللہ کے سامنے رونے والا! اپنے بچوں کے لیے اللہ سے مانگنے والا!

ایک آیت مبارکہ میں یہ آیا ہے:

''ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِه.'' [فاطر:32]

''پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا، جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے بطور خاص چن لیا تھا۔ پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں، جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں۔''

بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے جو صاحب قرآن (قرآن پاک کا حافظ یا کسی اور حوالے سے قرآن کی مشغولیت رکھنے والا) صبح کو اٹھ کر تہجد میں اللہ سے ہم کلام نہیں ہوتا، ''ظالم النفس'' سے وہی مراد ہے۔

تہجد کے بارے میں، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا حکم تو ہے ہی حفاظ کے لیے۔ جن کو اللہ نے قرآن پاک دیا ہے، انہی کو صبح کے وقت میں کھڑے ہو کر تلاوت کا حکم فرمایا ہے۔ اللہ تعالی شانہٗ کا ارشاد ہے: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا.'' [بنی اسرائیل:78] ''یاد رکھو کہ فجر کی تلاوت میں (فرشتوں کا) مجمع حاضر ہوتا ہے۔'' جی ہاں! فجر کی تلاوت فرمایا، عصر کی نہیں۔ حقیقت یہ ہے صبح کے وقت میں تلاوت کا جو لطف آتا ہے، اور کسی وقت میں نہیں آتا۔ یوں پڑھنے والے کو فرشتوں کے نازل ہونے کا واقعی احساس ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر (اردو):212)

دوسری جگہ پر فرمایا: ''قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا'' [المزمّل:2] ''رات کا تھوڑا سا حصہ چھوڑ کر

باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔"

تیسری جگہ ارشاد ہے: "اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا" [المزمل:6]

"بے شک رات کے وقت اٹھنا ہی ایسا عمل ہے جس سے نفس اچھی طرح کچلا جاتا ہے، اور بات بھی بہتر طریقے پر کہی جاتی ہے۔"

ایک اور مقام پر ہے: "وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا" [الدھر:26]

"اور کچھ رات کو بھی اس کے آگے سجدے کیا کرو، اور رات کے لمبے وقت میں اس کی تسبیح کرو۔" یہ اور اس طرح کی دیگر آیات حاملینِ قرآن اور معلمینِ قرآن کو اپنے منصب کے تقاضے کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔

دن کے اوقات میں باقی مصروفیات کے ساتھ ساتھ دو رکعت نفل اشراق کے لیے وقت نکالنا کچھ مشکل نہیں۔ اگر اللہ کے ساتھ تعلق ہوگا تو مدرس یہ چاہے گا کہ اس وقت میں جہاں اور کام کروں، ناشتہ وغیرہ کروں جلدی جلدی وضو کر کے دو نفل اشراق کے بھی پڑھ لوں۔ یہی وقت عموماً درس گاہ میں پہنچنے کا ہوتا ہے۔ ہم اشراق پڑھ کر اللہ سے مانگ کر اور یہ دعا کرتے ہوئے درسگاہ میں آ کر بیٹھیں کہ "اے اللہ! میں درسگاہ میں جا رہا ہوں، میری مدد فرما! میرے ذہن اور سینے کو کشادہ فرما! اس کام کی جو گتھیاں ہیں، وہ میرے لیے کھول! تا کہ میں طلبہ کی صحیح طریقے سے خدمت کر سکوں۔"

آج مدرسین رزق کی تنگی کا شکار رہتے ہیں، حالانکہ ہر حال میں ہمیں شاکر ہی ہونا چاہیے۔ بہر حال! اس تنگی کا علاج بھی نوافل میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اللہ عزوجل فرماتا ہے اے ابن آدم! تو شروع دن میں چار رکعتیں ادا کرنے سے عاجز نہ ہو، میں آخر دن تک تیری کفایت کروں گا۔" (السنن الکبری، رقم: 468، 177/1)

اس لیے کہ یہ وقت عین کاروبار کا ہوتا ہے۔ لوگ دکانوں کی طرف بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ مگر جو وقت نکال کر اللہ کے سامنے جبینِ نیاز رکھتا ہے، حق تعالی شانہٗ اس کے لیے رزق کے

دروازے اور وسیع فرما دیتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بڑے اونچے کام کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ نہ معلوم کتنی قسم کی کوتاہیاں ہم سے ہوتی ہیں۔ اس لیے مدرس کے لیے توبہ واستغفار بہت ضروری ہے۔ آپ نوافل ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ سے توبہ واستغفار کر کے اس عظیم کام کے دوران ہونے والی کمی کوتاہی کا ازالہ کر سکتے ہیں۔

مدرسین کی ایک بڑی تعداد سنتوں کے حوالے سے کوتاہی کا شکار رہتی ہے۔ ایسے حضرات کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ہم صبح سے پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت تھکاوٹ کی وجہ سے سستی ہو جاتی ہے۔ سنتوں اور نوافل کا اہتمام نہ کرنے والوں نے فقہائے کرام کا بیان کیا ہوا یہ جزیہ یاد کر رکھا ہے: ''جو قرآن پاک پڑھنے، پڑھانے، دین کی سمجھ حاصل کرنے اور دین سکھانے میں اس طور پر مشغول ہے کہ اسے نفل پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی تو اس کے لیے نفل چھوڑنے کی گنجائش ہے۔'' [فی الشامية: ولذا يتركها لو خاف فوت الجماعة، وأفاد ط أنه ينبغي أن يكون القاضي وطالب العلم كذلك، لاسيما المدرس. أقول في المدرس نظر، بخلاف الطالب اذا خاف فوت الدرس أو بعضه. تأمل. (ردالمحتار: 15/2، ايج، ايم، سعيد.... كذا في الهندية: 112/2)]

لیکن اس مدرس کے پاس صبح سے شام تک اگر وقت نہیں ہے تو صرف پڑھانے کے لیے نہیں ہے۔ باقی ہر چیز کے لیے اس کے پاس وقت ہے.... تو کیا اس کے لیے نفل چھوڑنے کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں!

☆☆☆

تہجد، استغفار، ذکر اور درود پاک کا التزام

مدرس کے ذاتی اعمال کے اثرات اس کی تدریس پر پڑتے ہیں۔ اگر اعمال درست ہیں، نیکی تقویٰ کا خصوصی اہتمام ہے تو اس کے اثرات درسگاہ اور بچوں پر ضرور پڑیں گے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو اثرات بھی ویسے مرتب ہوں گے۔ ایک وہ مدرس ہے جو صبح اٹھتا ہے، تہجد پڑھتا ہے، اس وقت میں اللہ کے سامنے یہ التجا کرتا ہے:

''اے اللہ! یہ کام آپ نے اپنے فضل سے میرے سپرد کیا ہے، میں تو اس کا اہل نہیں تھا، نہ مجھ میں صلاحیت ہے۔ اے اللہ! تو مجھے صلاحیت بھی عطا فرما۔ مجھے شیطانی وساوس سے بھی محفوظ فرما۔ اے اللہ! پورا دن مجھے اخلاصِ نیت کے ساتھ، پوری قوت اور ہمت ان بچوں پر صرف کرنے کی توفیق نصیب فرما!''

تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس کے کام میں کتنی رونق، برکت اور آسانی ہوگی۔

لہٰذا ہر مدرس کو چاہیے کہ صبح رو رو کر تہجد میں اللہ کے سامنے یہ التجا کرے۔ اس کے بعد تیاری کر کے وقت پر درسگاہ میں آئے۔ پورا دن صحیح گزارے اور رات کو اللہ سے استغفار کرے، یہ مدرس کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بڑے عظیم الشان کام کے لیے اللہ نے آپ کو منتخب فرمایا ہے۔ نہ معلوم کتنی قسم کی کوتاہیاں ہم سے ہوتی ہیں۔ ہم توبہ واستغفار کر کے ان کا ازالہ ساتھ ساتھ کر سکتے ہیں۔

یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ قرآن پاک میں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ، اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ [ہود:114]﴾

''اور (اے پیغمبر!) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

استغفار کی یہ کثرت کس قدر اہم ہے؟ ایک اور حدیث پاک میں اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ ، لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ ، فَیَغْفِرُلَھُمْ . (صحیح المسلم :355/2، قدیمی کتب خانہ)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہیں کرو گے (یعنی گناہ اور اس کے فوری بعد استغفار) تو اللہ تمہیں ختم کر کے ایسی قوم کو وجود بخشے گا جو گناہ کریں تو استغفار بھی کریں گے، اور اللہ ان کی مغفرت کر دے گا۔''

ایک مدرس اپنی یہ عادت بنالے کہ رات کو محاسبہ کامل کر کے سوئے کہ آج مجھ سے یہ غلطیاں ہوئی ہیں۔ پھر ان پر نادم ہو کر ایک تسبیح استغفار کی کر لے.... استغفر الله، استغفر الله.... اپنی کوتاہیاں سوچتا جائے اور ہر ایک پر استغفار کرتا جائے۔ اللہ سے عہد کرے کہ آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ توبہ کے تین ارکان ہیں: ایک، گناہ سے فوری طور پر الگ ہو جانا۔ دوسرے، جو کچھ ہو چکا اس پر دلی شرمندگی ہو اور تیسرے، اس بات کا پختہ عزم کہ آئندہ اس گناہ کے قریب نہیں پھٹکے گا۔'' (شرح صحیح المسلم للامام النووی:354/2، قدیمی)

اس طرح پر وہ استغفار کرے گا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں... ان شاء اللہ اس کے معمولات سنورنے لگیں گے۔ قانون کی پابندی اور پاسداری آسان ہو جائے گی۔ کام میں برکات اور ترقیات واضح محسوس کرے گا۔

مگر جس کو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ آج میرا سارا دن کیسے گزرا۔ اس پر کبھی غور ہی نہ کرے تو اب مدرس چاہے 20 سال بھی پڑھاتا رہے، وہ کبھی صحیح رخ پر چل سکے گا نہ ہی مطلوبہ فوائد وثمرات مل پائیں گے۔ یہ بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔

اسی طرح پر ذکر کا اہتمام بھی ہماری زندگیوں سے جاتا رہا۔ ہمارے حضرت مفتی عبدالستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس، ملتان والے) ہر مجلس میں اس کا رونا روتے تھے کہ

عوام الناس تو اس کا خیال کرتے ہیں، مگر آج کے علما، حفاظ اور قراء ذکر سے اتنا دور ہو گئے ہیں کہ وہ ذکر کرنے کو گویا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک بہت پرانے مدرس سے سوال کیا کہ ہر روز کتنا درود شریف پڑھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جو نماز میں ہے، وہی پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ کبھی نہیں پڑھا۔ اس کا جواب سن کر حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ پتہ نہیں میری زبان سے کتنی مرتبہ بے ساختہ "اِنا للّٰہ و انا الیہ راجعون" نکلا کہ اتنے بڑے مدرس اور ان کا یہ جواب! کیا ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ صرف ایک ضروری درود شریف جو نماز والا ہے، اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے، ورنہ اس مدرس جیسے کتنے اور ہیں جن کو درود پاک کی توفیق نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کے طفیل ہی تو ہمیں یہ نسبت حاصل ہو رہی ہے۔ اگر ہم ایک تسبیح درود شریف کی روزانہ پڑھ لیا کریں تو ہمارا ان کی ذات پر کوئی احسان نہیں ہوگا۔ یہ تو اللہ کی توفیق ہوگی اور ہمارا اپنا فرض۔ یہ بہت ہی آسان عمل ہے۔ درود شریف کثرت سے پڑھنے والے کے لیے رزق کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اس کے کاموں میں آسانی ہو جاتی ہے۔ درود شریف، ذکر، استغفار اور تیسرے کلمے کی تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰہ و الحمدُ لِلّٰہِ ولا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ العَظِیْم" پڑھنے والا شیطان کے وساوس سے محفوظ رہتا ہے۔

احادیث میں یہ بھی آیا ہے: "جس نے روزانہ سو دفعہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہ" کہا اس کے قصور معاف کر دیے جائیں گے، اگرچہ کثرت میں سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں۔" (معارف الحدیث: 51/5) لہٰذا اس کی پابندی، اس کا اہتمام اور اس کا التزام کرنا چاہیے۔

☆☆☆

''حفظ'' کی حفاظت کیجیے

ایک اور اہم بات جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ایک مدرس قرآن اگرچہ ہمہ وقت قرآن پاک کی خدمت میں ہی مشغول ہے۔ وہ پڑھا رہا ہے، کہلوا رہا ہے یا پھر سن رہا ہے۔ اس طرح قرآن پاک کے صفحات اور سورتیں ہر وقت اس کے سامنے ہیں، مگر اس سب کے باوجود وہ اپنی منزل اور اپنا حفظ پختہ کرنے کا محتاج ہے۔ اسے ایک ترتیب، تسلسل اور پابندی کے ساتھ تلاوت کا معمول بنانے اور سننے سنانے کا نظم قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

سو، مدرسین کرام اپنے حفظ اور منزل کی بہت زیادہ فکر کریں۔ یاد رکھیں! قرآن پاک حفظ کرنا ضروری نہیں، یہ دولت حاصل کر لینے کے بعد اس کی حفاظت لازم ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی بھی رمضان میں ''مصلّی'' سنانے کا ناغہ کبھی نہ کریں۔ میں اپنے زیر تعلیم اور فارغ التحصیل طلبہ کو سب سے زیادہ اسی بات کی تاکید کیا کرتا ہوں۔ اگر ہم قرآن پاک کی آیات میں غور کریں اور پڑھ کر بھلا دینے اور پھر قرآن پاک کے مطابق زندگی نہ گزارنے کا وبال ہمارے سامنے آئے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى" . [طٰہٰ:124] فرمایا: ''جو شخص اس نصیحت (قرآن پاک) سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''

حافظ قرآن کی ''تلاوت'' سے بے توجہی، غفلت اور یاد کر کے بھلا دینا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس پر اللہ کی شدید ناراضگی لفظ ''اعمٰی'' سے ظاہر ہے۔ یعنی قیامت کے دن اسے اندھا کر کے اٹھائے جانے کی سخت وعید ہے۔ اسی طرح پر اس سے اگلی آیت ہے: "قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا، وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى" . [طٰہٰ:126] ''اللہ کہے گا: اسی طرح

ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، مگر تو نے انہیں بھلا دیا۔ اور آج اُسی طرح تجھے بھلا دیا جائے گا۔"

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس کا مطلب صرف یہ ہی نہیں کہ قرآن پاک یاد کیا، پھر بھلا دیا۔ بلکہ وہ شخص جسے خداداد ذہانت کے بل بوتے پر ایسا پختہ یاد ہو کہ پڑھے بغیر بھی نہ بھولنے کا پختہ یقین ہو، اور اسی بنا پر وہ تلاوت کا اہتمام نہ کرے تو اسے بھی بُھلا ڈالنے والا شمار کیا جائے گا۔ (مرقاة المفاتيح:643/4،مکتبہ رشیدیہ)

مدرسین حضرات (شعبہ کتب کے ہوں یا شعبہ حفظ کے) قرآنی خدمات میں مشغول رہتے ہوئے اپنے آپ کو تلاوت کے اہتمام سے مستغنی سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ہمارے اکابر کا معمول اس کے برعکس تھا۔ جو جتنے بڑے عالم تھے، ان کے حالات زندگی میں تلاوت کا اہتمام اتنا ہی زیادہ ملتا ہے۔

بہرحال! حفظ قرآن جتنی بڑی "سعادت" ہے، اس سے بڑھ کر یہ ایک "ذمہ داری" ہے، اس کا احساس کیجیے۔ اپنے حفظ کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہوئے روزانہ کے حساب سے تلاوت کا نظم بنائیے۔ پھر پابندی کے ساتھ ہمیشہ اس معمول کو پورا کیجیے۔ آپ کے فارغ التحصیل شاگرد بھی اس سبق لیں گے اور نصیحت پکڑیں گے۔

اصلاحی تعلق قائم کرنا

ایک کامیاب مدرس کے لیے جن ناگزیر اوصاف کی موجودگی ضروری ہے، ان سب کے حصول کے لیے اور اپنے کام میں برکت، ترقی اور قبولیت کے لیے "اصلاحی تعلق" قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے جتنے بھی اکابر گزرے ہیں، ان کا اپنے زمانے کے اہل اللہ سے مضبوط اصلاحی تعلق تھا۔ یہ ان کی زندگی کا لازمی حصہ تھا۔ آج ہماری زندگی سے دین کا یہ اہم جز نکلتا جارہا ہے، حالانکہ تزکیہ نفس فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے کسی اللہ والے سے اصلاحی تعلق قائم کیے بنا چارہ نہیں۔ سو، اگر آپ ابھی تک بیعت نہیں ہوئے کسی اللہ والے سے اپنا تعلق جوڑ لیں۔ اُن کی ہدایات کے مطابق چلنے کی کوشش کریں۔ اس سے آپ میں مان کر چلنے کی ایک عادت پیدا ہو جائے گی۔ یہ عادت جب پختہ ہو جائے گی تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ شریعت پر چلنا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر چلنا بھی آسان ہو جائے گا۔

آپ کبھی غور کریں جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے بڑے پیمانے پر دین کا کام لیا ہے، ان کی کامیابی کے پیچھے یہی راز پوشیدہ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو کسی اللہ والے کے ایسے سپرد کر دیا جیسے کوئی مردہ آخری غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ان کے کام میں کیسی برکت تھی! لیکن جو صاحب استعداد تو تھے مگر کسی پیر و مرشد کے ذریعے اپنی کامل اصلاح نہ کروائی تو صرف ان کی ظاہری صلاحیتیں انہیں کسی بڑی کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکے، لہٰذا بلا تاخیر اپنے قرب و جوار میں موجود جس صاحب نسبت اللہ والے بزرگ سے قلبی مناسبت پائیں، ان سے اصلاحی تعلق قائم کر لیں۔ پوری فکرمندی کے ساتھ اپنی اصلاح کرائیں..... پھر دیکھیں کس طرح اللہ تعالیٰ آپ سے اپنے دین کا کام لیتا ہے۔

☆☆☆

تیسرا باب

چند قابلِ اصلاح امور

پانچ وقتہ نماز اور مدرسین

آج کل کے مدرسین کی کمزوریوں میں سے ایک نہایت سنگین کوتاہی جماعت اور نماز کا خیال نہ کرنا ہے۔ جو نماز با جماعت کا اہتمام نہیں کرتا، خواہ وہ محنت بھی کرتا ہو، اس کی درس گاہ میں نکھار نہیں آسکتا۔ یہ بات مدرسین سے متعلق کہی جارہی ہے، عوام سے مخاطب ہو کر نہیں۔ آج ہمارے مدرسین کی زندگیوں سے فرض نمازوں کا ''اہتمام'' نکل گیا ہے۔ اذان ہوتے ہی درس گاہ کو موقوف کر دیں۔ استنجا اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر وقت سے پہلے مسجد میں پہنچ جائیں۔ سنتیں ادا کریں اور جماعت کے انتظار میں بیٹھ جائیں۔ اس کو کہتے ہیں اہتمام! مگر شاید کوئی ہزاروں میں دس ایسے نکلیں گے جو نماز کا...... صف اوّل میں اور تکبیر اولیٰ کے ساتھ...... با قاعدہ اہتمام کرتے ہوں۔

اکثر مدرسین کی تکبیر اولیٰ فوت ہو جاتی ہے۔ کچھ رکعتیں چھوٹ جانا تو معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ جماعت کو ترک کرنے والے بھی تعداد میں کچھ کم نہیں۔ ایسے مدرس بھی ہمارے علم میں آئے جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔ یہ چیز ہماری ''عظیم نسبت'' کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ ان وجوہ سے عوام الناس میں ہمارے بارے میں جو نظریہ قائم ہوتا جارہا ہے، وہ ہماری پوری برادری کے نام پر بدنما دھبہ ہے۔ عام لوگوں کی زبانی سننے میں آتا ہے: ''فلاں شخص حافظ بھی ہے، مدرس بھی ہے، لیکن نمازیں نہیں پڑھتا، نمازوں کا اہتمام اس کے اندر نہیں ہے۔''

نماز کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ یہ حق وہ شخص کبھی نہیں چھوڑ سکتا جس کے دل میں اللہ تعالیٰ سے حیا موجود ہے۔ پھر مخلوق کے حقوق کا بھی وہی لوگ خیال کرتے ہیں جو خالق کے حقوق کو اہمیت دینے والے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں معروف ہے۔ آپ کسی شخص کو کسی بھی منصب پر مقرر کرنے کا ارادہ فرماتے تو پہلے، جہاں اس کی زندگی

کے دیگر احوال کے متعلق پڑتال فرماتے، وہیں خصوصی طور پر اس کی نماز کے بارے میں تحقیق کرتے کہ نماز کے اہتمام کے حوالے سے اس کا رویہ کیسا ہے؟ نمازیں تو ضائع نہیں کرتا۔ اگر اس میں یہ کوتاہی موجود پاتے تو اس کو اس منصب کا اہل ہی نہ سمجھتے اور فرماتے:

" ...انَّ أهَمَّ أمْرِكُمْ عِنْدِيْ الصَّلاَةُ، فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا ، حَفِظَ دِيْنَهُ، وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أضْيَعُ." (موطاامام مالك رحمه الله بروايةالليثى: 6/1، دار احياء التراث ،بيروت)

"بلاشبہ میرے نزدیک تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری نماز کا اہتمام کرنا ہے۔ جس نے نماز کی حفاظت اور اس پر ہمیشگی اختیار کی، اس نے اپنے دین کو محفوظ بنالیا اور جو نماز کو ضائع کرتا ہے (اللہ کے حقوق کو ضائع کرتے ہوئے نہیں شرماتا، اس کے نزدیک بندوں کے حقوق کیا معنی رکھتے ہیں؟) وہ اس کے علاوہ (دیگر حقوق) کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔"

نماز کے اہتمام کے حوالے سے اپنے اکابر کی زندگی سے روشنی حاصل کرتے چلیے۔ حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے اہتمامِ نماز میں فرق آیا ہو۔ میں اپنی تیری سالہ خدمت کے دوران ہمیشہ یہی دیکھا، ہم سے پہلے والوں نے بھی بتایا اور بعد والوں کا بھی یہی مشاہدہ ہے کہ آپ ہمیشہ پہلی صف میں امام کے پیچھے والی جگہ پر نماز پڑھتے۔ سیکڑوں مرتبہ حضرتؒ کے ساتھ سفر کیا۔ سفر میں بھی یہی ترتیب دیکھنے کو ملی۔ جس محلے میں جا کر ٹھہرتے، اس مسجد میں اپنے معمول کے مطابق پہلی صف میں امام کے متصل پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا فرماتے۔

ہمارے بڑے اسلاف میں یہی چند چیزیں تھیں، جن کا فیض، اللہ نے کہاں کہاں پہنچا دیا۔ آج پوری دنیا میں ان کے فیوض و برکات پھیلے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

تربیت، حکمت کے ساتھ

"سختی" سے گریز کیجیے:

مدرس کی زندگی میں ایک نہایت حساس مرحلہ طلبہ کی ڈانٹ ڈپٹ کا ہے۔ طلبہ کی تعلیم اور تربیت کے دوران بہت سے مقامات پر استاد ناراض ہوتا، پریشان ہوتا یا اسے غصہ آتا ہے۔ ایسے موقع پر استاد کی دانش مندی، حکمت عملی اور صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ اسے ایسے انداز سے چلنا ہے کہ طالب کی تعلیم و تربیت کا بھی حرج نہ ہو اور بے جا سختی اور غصے کے استعمال کی وجہ سے طالب علم یا اس کے والدین متنفر بھی نہ ہوں۔

معلمین کو چاہیے کہ اپنے طلبا کے بارے میں محتاط رہیں۔ کوئی غلطی کی ہے اس کو نرمی سے سمجھائیں کہ بھئی! ایسا نہ کریں۔ اس میں سراسر آپ کا نقصان ہے۔ اس میں آپ کی تعلیم کا حرج ہے۔ اس سے آپ کی تربیت متاثر ہو سکتی ہے۔ اس سے آپ میں اخلاقی بگاڑ آئے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو "معلم" فرمایا۔ آپ بحیثیت مدرس ہمارے لیے سب سے عظیم نمونہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ"...... "ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر (اے پیغمبر!) تم نے ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا...... "وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ" اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے"...... (اور صحابہ کا مواخذہ آپ سختی کے ساتھ فرماتے تو یہ جو آپ کے اردگرد ہر وقت پروانوں کا جمگھٹا لگا ہوا ہے، یہ نہ ہوتا)...... "لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔" [آل عمران:159]

دیکھیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے، جوان اور بوڑھے صحابہ کرامؓ کو قرآن پاک

پڑھایا، مگر آپ سے اپنے طلبہ کو مارنا کہیں منقول نہیں۔

آپ معلم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ارشاد فرمایا: "انما بُعِثْتُ مُعَلِّماً۔"...... "مجھے معلم بنا کر ہی بھیجا گیا ہے۔" (احکام القرآن للجصاصؒ: 226/5، دار احیاء التراث، بیروت) یہ قواعد وضوابط آپ کو ایک معلم ہونے کی حیثیت سے بتائے جا رہے ہیں۔ آپ نے اپنے شاگردوں، اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح پر رہنا ہے۔ سورہ آل عمران کی اسی آیت میں مزید فرمایا گیا: "فَاعْفُ عَنْهُمْ" [آل عمران:159] "لہٰذا ان کو معاف کردو۔"

لہٰذا کوئی دیر سے آ گیا ہے، کسی نے کوئی اور شرارت کرلی ہے اس کو بھی معاف کرتے رہا کریں۔ سمجھانے کی کوشش کریں۔ ضرورت پڑنے پر احسن طریقے سے مواخذہ بھی کرلیا، مگر اپنی عادت اکثر معاف کرنے کی بنائیں۔ آپ ان کو سمجھانے کی ذمہ داری سے بری نہیں ہیں۔ ان کی تربیت بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ وہ بھی آپ ہی نے کرنی ہے۔ آپ کو "تزکیہ" کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے۔ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ جو اخلاق حسنہ ہیں انہیں سمجھا سمجھا کر ان کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جو برے اخلاق ہیں، کھینچ کھینچ کر ان کے اندر سے نکالے جائیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی احتیاط اور خدا خوفی:

ہمارے حضرت قاری صاحب طلبہ کی ڈانٹ ڈپٹ سے متعلق کس قدر محتاط اور خدا خوفی کا اہتمام کرتے تھے، اس حوالے سے حضرت کے تین واقعات عرض کرتا ہوں:

1...... جب میں پہلے سال حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے پاس داخل ہوا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ابھی میرے داخلے کو چند دن ہی گزرے تھے کہ حضرت کے ہاتھ سے مجھے کچھ زیادہ سزا مل گئی۔ میں ایک شہری (غیر رہائشی) طالب علم تھا۔ صبح کو آتا اور شام کو اپنے گھر جاتا تھا۔ ایسے طالب علم کو اگر زیادہ سزا مل جائے تو والدین کے اوپر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر حضرت کا معمول یہ ہوتا تھا کہ اس وقت تک بچے کو گھر نہیں جانے دیتے تھے،

جب تک اس سے اپنا معاملہ صاف نہ فرما لیتے۔ معاملہ صاف کرنے کا مطلب یہ کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کو راضی اور خوش کرنا اور اس کے ذہن سے یہ بات نکالنا کہ آج مجھے سزا ملی ہے، چنانچہ آپ تھوڑی دیر کے بعد بچے کو بلا کر کہتے: "دیکھو بیٹا! آپ نے یہ غلطی کی تھی، اس لیے آپ کو سزا مل گئی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو مجھے کیا ضرورت تھی آپ کو سزا دینے کی۔"

یہ بات کر کے کبھی تھوڑا سا دودھ پلا دیا۔ کبھی کچھ نقد پیسے دے دیے۔ یا کوئی چیز آئی ہوئی ہو، ساتھ بٹھا کر کھلا دی۔ کھانا آیا ہوا ہے، اس میں شریک کر لیا۔ کسی ہدیے میں سے کوئی چیز نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ تمام طریقے تھے، جن سے بچے کے دل سے وہ بات بالکل ہی زائل ہو جاتی تھی کہ استاد نے مجھے سزا دی ہے۔ آپؒ کا معمول یہ تھا کہ چھٹی سے پہلے پہلے اپنا معاملہ صاف فرما لیتے، تاکہ استاد سے دوری کے جذبات بچہ درسگاہ سے لے کر باہر نہ جائے۔

بہرحال! میرے ساتھ اتفاق ایسا ہوا کہ سزا دے دی لیکن اس کے بعد اس کا موقع نہیں آیا کہ اس کا تدارک کیا جاتا۔ میں گھر چلا گیا۔ بعد میں حضرت قاری صاحبؒ نے مجھے بتایا کہ نامعلوم رات کو اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کتنی مرتبہ اور صبح تہجد کے وقت میں نے دعا کی: "یا اللہ! اس مار کو اس بچے کے لیے نافع بنا دے اور تنفر سے اس کو محفوظ فرما۔" فرماتے ہیں: "صبح کو جب میں درسگاہ میں آیا تو ابھی میں دروازے پر ہی تھا۔ سب سے پہلی نظر میں نے تیری جگہ پر ڈالی کہ تو وہاں موجود ہے یا نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے یہ وسوسہ تھا کہ وہ آج پڑھنے نہیں آئے گا، لہٰذا درسگاہ کے دروازے پر آتے ہی تیری جگہ پر نظر ڈالی کہ تو آیا ہے یا نہیں۔ فرمایا کہ جب میں نے دیکھا کہ تو آیا ہوا ہے تو مجھے یقین ہو گیا ان شاء اللہ یہ بچہ کامیاب ہوگا۔" ایک استاد اپنے طالب علم پر ذرا سختی کرنے کے بعد کس طرح پر فکر مند ہے۔ پوری رات بے چین رہا ہے۔ صبح تہجد میں گریہ وزاری بھی کر رہا ہے۔ اسے فکر لگی ہوئی ہے کہ صبح بچہ پڑھنے آتا ہے یا نہیں؟ ہم ذرا اپنے دل کی کیفیت تو معلوم کر لیں، کیا ہمارے اندر بھی یہ جذبات ہیں؟

2......ہم سالہا سال تک حضرت قاری صاحبؒ کا یہ طرزِ عمل دیکھتے آئے کہ سال کے آخر میں آپ بچوں کو جمع کر کے جہاں اور وعظ و نصیحت فرماتے، اس میں خصوصی طور پر بچوں سے

علی الاعلان اور برملا معافی مانگتے۔ پھر حلف اٹھا کر فرماتے کہ میں نے اپنے نفس کے لیے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ میں نے آپ کے فائدے کے لیے آپ کی فہمائش کی۔ پھر بھی اگر کسی کے دل میں کوئی میل ہے تو اللہ کے لیے مجھے معاف فرما دیجیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس سال ہم حفظ مکمل کر کے فارغ ہو رہے تھے، جب حضرت نے یہ بات کی تو پوری درسگاہ کی چیخیں نکل گئیں۔ آہ و بکا کا ایک پورا سماں تھا۔

[مرتب عرض کرتا ہے کہ ہمارے ممدوح گرامی حضرت اقدس مولانا قاری محمد یاسین صاحب مدظلہ بھی اپنے عالی مقام استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوے اسی اصول پر کاربند ہیں۔ ہر سال اساتذہ اور طلبہ سے الگ الگ مجالس میں آپ کو "دست بستہ" دیکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ آپ کی لجاجت کو دیکھتے ہوئے طلبہ کی دھاڑیں نکل جاتی ہیں۔ مدرسین کے لیے ان اکابر کے عمل میں تقلید کا عمدہ نمونہ موجود ہے۔]

3...... ایک مرتبہ میرا کراچی جانا ہوا۔ وہاں حضرت مولانا احتشام الحق صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا احترام الحق سے ملاقات ہوئی۔ حضرت قاری صاحبؒ کا ایک عجیب واقعہ انہوں نے مجھے سنایا۔ یہی واقعہ اس کے بعد انہوں نے وہیں پر ایک خطاب میں بھی ذکر کیا۔ مولانا احترامُ الحق نے حضرت کے پاس گردان کی تھی۔ فرماتے ہیں: ایک سال میں نے مسجد نبوی میں مسنون اعتکاف کیا ہوا تھا۔ ایک دن اشراق کے بعد راستے میں حضرت قاری صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ آپ مواجہ شریف سے باب السلام کی طرف آرہے تھے۔ میں باب السلام کی جانب سے مواجہہ شریف کی طرف جا رہا تھا۔ ملاقات ہو جانے پر فرمانے لگے: "بھائی احترام الحق! میں نے تمہاری آمد کا سنا تھا۔ اللہ نے ملوا دیا......"

یہ قصہ سناتے ہوئے مولانا احترام الحق جلسے میں، بھرے مجمع میں، سب کے سامنے زاروقطار رونے لگے۔ جب انہوں نے مجھے سنایا تھا تب بھی بہت روئے تھے۔ فرمانے لگے: حضرت نے میرا ہاتھ پکڑا اور اسی طرح مواجہہ شریف پر لے گئے۔ پھر فرمایا: احترام الحق! میں آپ کو اس روضے والے کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھ سے تعلیم کے دوران میں کوئی زیادتی، کوئی سختی

ہوئی ہو، اللہ کے لیے مجھے معاف کردو۔ ان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، میرا مواخذہ نہ کرنا۔ وہ فرماتے ہیں: میں عرض کرتا بھی رہا، حضرت! وہ تو آپ نے ہماری اصلاح کے لیے اور ہماری غلطیوں پر ہی سب کچھ کیا ہے۔ حضرت فرمانے لگے: نہیں نہیں، بس! جیسے بھی کیا ہے آپ مجھے اللہ کے لیے معاف فرمادیں۔ کہتے ہیں: جب تک میں نے زبان سے یہ کہہ نہیں دیا: میں نے اللہ کے لیے معاف کیا، اس وقت تک مجھے نہیں چھوڑا۔

[حضرت مولانا احترام الحق تھانویؒ کا مذکورہ بالا خطاب مدرسہ روضۃ القرآن حسین آباد، کراچی، جناب قاری احسان الحق کے ہاں ہوا تھا۔ مرتب بھی حاضر تھا۔ دیکھا کہ خدا خوفی کا یہ واقعہ سن کر عقیدت مندوں کے علاوہ عوام الناس کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔]

تدریسی زندگی کی ایک اہم دعا:

تدریسی زندگی میں باوجود احتیاط کے اگر طالب علم پر سختی ہو جائے تو ایسے طلبا کے بارے میں خصوصی طور پر توبہ استغفار اور کرتا رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے: "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَتَّخِذُ عِنْدَکَ عَھْدًا لَّنْ تُخْلِفَنِیْہِ؛ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّمَا مُؤْمِنٍ اٰذَیْتُہٗ اَوْ شَتَمْتُہٗ اَوْ جَلَدْتُّہٗ اَوْ لَعَنْتُہٗ، فَاجْعَلْھَا لَہٗ صَلٰوۃً وَّ زَکٰوۃً وَّ قُرْبَۃً تُقَرِّبُہٗ بِھَا اِلَیْکَ." (صحیح المسلم: 2007/4، داراحیاء التراث، بیروت و مناجات مقبول المنزل الرابع) "یا اللہ! میں آپ سے وعدہ لیتا ہوں جسے آپ ضرور پورا فرمائیں گے کہ میں بھی آخر بشر ہوں، سو جس کسی مسلمان کو میں تکلیف دوں یا اسے برا بھلا کہوں یا اسے ماروں، پیٹوں یا اسے بددعا دوں تو اس (سب) کو آپ اس کے حق میں رحمت اور پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیجیے، جس سے آپ اس کو اپنا مقرب بنائیں۔"

اس دعا کا اہتمام رکھے۔ ضمیر کے مرجع میں خاص طور پر ایسے طلبا کی بطور خاص نیت کر لیا کرے جن پر سختی ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کی شان کریمی سے امید ہے کہ شفقت و خلوص کی بنا پر اس کی گئی تادیب کی صفائی ہو جائے گی۔

☆☆☆

اکابر کے علمی اختلافات کو اُچھالنا

آج ہماری عادت یہ ہے کہ ہمارا کام پورا ہو یا نہ ہو۔ درس گاہ کا جو منصب ہمیں ملا ہے، جو ذمے داری ہمیں سونپی گئی ہے وہ پوری ہو نہ ہو، لیکن باہر کے لوگوں پر تبصرے ضرور کرنے ہیں۔ یہ پانی پتی ہے، یہ لاہوری ہے۔ یہ فلاں ہے، یہ فلاں ہے۔ اس قسم کے تبصرے کرنے کے لیے ہمیں بہت وقت مل جاتا ہے۔ ہمارے ان تبصروں کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارے اکابر کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اور اس قسم کے تبصرے کر کے ہم اپنے لیے تباہی کا کیا سامان کر رہے ہیں؟ انہی باتوں کے جائزے کے لیے دو واقعات عرض کرتا ہوں:

پہلا واقعہ:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے اپنے بڑے حضرات کے ساتھ راولپنڈی سے ملتان تک کا سفر کرنا تھا۔ حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ، حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ اور ان کے ایک شاگرد قاری سیف الدین صاحب دامت برکاتہم ہم سفر تھے۔ میں بھی بطورِ خادم ان حضرات کے ساتھ تھا۔ حضرت قاری صاحبؒ اور قاری فتح محمد صاحبؒ کی سفر کے حوالے سے عادتِ مبارکہ ہم نے یہ دیکھی کہ نماز کا پہلے سے بہت زیادہ اہتمام فرماتے۔ پنڈی سے چلے ہیں تو دیکھا، عصر اور ظہر کی نماز ہم نے کہاں کہاں ادا کرنی ہے۔ اگر پورا سفر ایک ٹکٹ کے ساتھ کرنے سے نماز کا حرج واقع ہو رہا ہوتا تو ٹکٹ ہی وہاں کا لیتے جہاں پر نماز پڑھی جاسکے۔ اس کے لیے آپ پہلے سے ڈرائیور سے بات کرتے کہ ہمیں ظہر فلاں جگہ پڑھانی ہے۔ ان شاء اللہ اتنے بجے، اتنے وقت کے دوران میں پڑھی جائے گی۔ اگر وہ ڈرائیور حیل وحجت کرتا تو ٹکٹ ہی اس جگہ کا لیتے، جہاں پر جا کر ظہر کی نماز ادا کرنی ہے۔

ہم یہاں پر لاہور پہنچے تو حضرت نے دیکھا کہ عصر کا وقت ہے، عصر ہم نے یہاں پڑھنی ہے۔ اگر ہم نے آگے سفر کیا تو مغرب کی نماز کا حرج ہوگا۔ پھر فرمانے لگے کہ چلو اتنے وقت میں حضرت قاری محمد شریف صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان کی زیارت کر کے آتے ہیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب، قاری رحیم بخش صاحبؒ اور میں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سبحان اللہ! ان کو اس شان میں دیکھا کہ مغرب کے بعد کا وقت ہے۔ ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ اس میں ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ آپ بغیر کسی چادر اور بستر کے اس پہ لیٹے ہوئے ہیں۔ پوشاک کا یہ حال ہے کہ ایک بنیان اور لنگی زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ جیسے گھر کے ماحول میں آدمی بے تکلف ہوتا ہے۔ یہ حضرات جب اچانک وہاں پر پہنچے، میں نے دیکھا کہ وہ اتنے خوش ہوئے، اتنے مسرور ہوئے، دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرطِ عقیدت سے سرشار ہیں، مگر ان کو بٹھانے کے لیے کوئی جگہ نہیں مل رہی۔ ان حضرات نے دو تین گھنٹے وہاں پر گزارے۔ رات کا کھانا بھی حضرت قاری محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھلایا۔ رات رہنے کے لیے اصرار کیا۔ چنانچہ جو محبت کا، آپس کے تعلق کا نقشہ میں نے یہاں دیکھا، ایک طرف یہ ہے، جبکہ دوسری جانب ان کے کچھ شاگردوں کے طرح طرح کے تبصرے ہیں۔ ان کے نام پر طرح طرح تفرقہ بازیاں ہیں۔

بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ان حضرات کی محبتیں کیا تھیں۔ ان کا آپس کا تعلق کیا تھا اور یہ نیچے والی پود ان پر کیا تبصرے کرتی ہے۔ ان حضرات نے صرف زبانی نہیں، اپنی تصانیف میں قلم کے ذریعے، ایک دوسرے کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ حضرت قاری محمد شریف صاحبؒ کی آپ کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں، مطالعہ کریں۔ ان کی 'شرح جزری' اور دیگر تصانیف ملاحظہ کریں، آپ کو جگہ جگہ پر حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ کی 'شرح جزری' کا حوالہ نظر آئے گا۔ یہ عبارت میں ان سے نقل کر رہا ہوں۔ انہوں نے کتاب اور مصنف کا نام لے کر لکھا ہے کہ میں وہاں سے یہ حوالہ نقل کر رہا ہوں۔ حضرت قاری فتح محمد کی 'عنایات رحمانی' شاطبی کی شرح دیکھ لیں۔ اس میں انہوں نے حضرت قاری محمد شریف صاحبؒ کے متعلق جو عظمت والے الفاظ استعمال

فرمائے ہیں، اس قسم کے الفاظ اور کتابوں میں کہیں میری نظر سے نہیں گزرے۔

دوسرا واقعہ:

میں ایک دفعہ کراچی میں حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت ڈاک لکھوار ہے تھے اور ایک منی آرڈر روانہ فرما رہے تھے۔ میں نے قریب بیٹھ کر دیکھا کہ حضرت نے ایک منی آرڈر حضرت مولانا قاری اظہار احمد تھانویؒ کی ذات کے لیے اور دوسرا ان کے مدرسے کے لیے روانہ فرمایا۔ آج ذرا ہم بھی آپس میں اس قسم کے تعلقات قائم کر کے دیکھیں۔ ہم بھی تو ہم عصر ہیں۔ اکابر اور ان کے ہم عصروں کے درمیان جو تعلقات، محبت، ایک دوسرے کی قدر و منزلت اور ایک دوسرے کی عظمت ان کے دلوں میں تھی، اس کا وہ برملا طور پر اظہار اپنی زبان، تحریر اور عمل سے فرماتے تھے۔

یہ تو تعلق ہے ان بزرگوں کا۔ ان کو ایک دوسرے کی پہچان تھی۔ ان میں سے ہر ایک جوہری تھا، وہ دوسرے کے جوہر کو پہچانتا تھا۔ ہمارے پاس نہ کوئی جوہر ہے، نہ ہی ان جیسا صبر اور حوصلہ ہے۔ صرف ایک "زبان" ہے، جو بلا سوچے سمجھے بس چلتی رہتی ہے۔ چند مسئلے اگر یاد کر لیے، کسی کی طرز اچھی ہوگئی یا کسی کو قرآن پاک زیادہ یاد ہوگیا، ان کے لیے وہ سب سے بڑی چیز بن جاتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ اوروں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں اور یہیں سے پھر.... پانی پتی، مصری.... پانی پتی، مصری... چل پڑتی ہے۔

ہم انہی کے نام لیوا ہیں۔ ہم نے ہی ان کی صفات اپنے اندر پیدا کرنی ہیں۔ ہم مدرسین ہیں۔ انہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ انہوں نے جس طرح پر تدریس کا زمانہ گزارا ہے، اس کی کوئی جھلک ہم اپنے اندر بھی پیدا کریں۔

☆☆☆

''ٹیوشن'' پڑھانے کے نقصانات

ایک سب سے بڑی بات جسے میں بددیانتی کہتا ہوں، یہ ہے کہ آج کل مدرسین میں ٹیوشن پڑھانے کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ اس چیز نے بڑا شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جب یہ ترتیب قائم تھی کہ اہلِ محلہ کے بچے مسجد میں آتے تھے۔ اللہ کے گھر کے ساتھ ان کا جوڑ پیدا ہوتا تھا۔ دیگر بچوں کے ساتھ ان کا اٹھنا، بیٹھنا ہوتا تھا۔ ہر طبقے کے بچے قرآن کی خاطر ایک ہی صف میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ پھر مسجد کے ماحول میں ان کی ہر لحاظ سے تربیت کی جاتی تھی۔ آج ٹیوشن نے یہ نقشہ بالکل بدل کے رکھ دیا ہے۔

اگر ایسے حضرات مختلف گھروں میں جا کر صحیح امانت و دیانت کے ساتھ پڑھاتے۔ جس کو پڑھا رہے ہیں، اس کی صحیح طور پر ذہن سازی کرتے تو پھر بھی کچھ زیادہ نقصان کی بات نہ تھی۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہیں آدھا گھنٹہ دیا ہوا ہے، کہیں پندرہ منٹ اور کہیں کچھ۔ انہوں نے یہ وقت پورا کرنا ہے اور چلے جانا ہے۔ ایک مہینے کے بعد پیسے وصول کرنے ہیں۔ اس سے بڑھ کر آگے پیچھے کا کوئی فلسفہ ان کے نزدیک بے معنی ہے۔

تدریس کے ساتھ ساتھ نماز کا طریقہ، اخلاق کی تربیت، کوتاہیوں پر تنبیہ بھی ان کے فرائض کا حصہ تھا، مگر صرف فیس کا بروقت وصول کرنا ہی ان کا مقصد حیات ٹھہرا ہے۔ جو لوگ آپ کو 2 سو، 5 سو یا ہزار ادا کر رہے ہیں، انہوں نے تو اپنا حق ادا کر دیا ہے، لیکن یہ آپ کے اوپر ہے کہ آپ کے ذمہ جو ان کا حق تھا، آپ نے ادا کیا یا نہیں؟

سب سے بہتر یہ ہے کہ یہ لائن بالکل چھوڑ ہی دینی چاہیے۔ اس میں بے برکتی بھی ہے اور بے عزتی بھی۔ رزق حاصل کرنے کی خاطر جز وقتی یا کل وقتی طور پر ٹیوشن کے لیے بھاگتے پھرنا

سائیکل، موٹر سائیکل پہ جا کر ایک ایک دروازہ کھٹکھٹاتا، اس میں آپ کی یا آپ کے علم کی کون سی عزت وقدر ہے؟ آپ گھنٹی بجاتے ہیں، شاگرد اندر ہی سے کہتے ہیں، استاد جی! آج آپ چھٹی کریں۔ کیا قدر کی ہم نے قرآن کی؟ وہ استاد جو طالب علم کو چھٹی دینے والا تھا کہ آج تیری چھٹی بند ہے۔ تم آج گھر نہیں جا سکتے۔ اس استاد کو طالب علم دروازہ کھولے بغیر اندر ہی سے چھٹی دے رہا ہے! اس پیسے میں قطعاً کوئی برکت نہیں ہے۔

ایک حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی ترغیب دی ہے۔ ایک صحابی نے آپ علیہ السلام سے دریافت کیا:

"یارسولَ اللّٰہ، دُلَّنِی عَلٰی عَمَلٍ إذا عَمِلتُہ أَحَبَّنِیَ اللّٰہُ و أَحَبَّنِی النَّاسُ ، فقَال : ازْھَدْ فِی الدُّنیا یُحِبَّکَ اللّٰہُ وَازْھَدْ فِیمَا عِندَ النَّاسِ یُحِبَّکَ النَّاسُ." (الاذکار النوویۃ: 407/1)

"یارسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتایئے کہ جب میں اسے انجام دوں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت فرمائیں اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت فرمائیں گے، لوگوں کے اموال سے بے پرواہو جاؤ، لوگ بھی تم سے محبت کریں گے۔"

ایک ٹیوشن پڑھانے والے سے بات ہوئی۔ وہ کہنے لگا: "الحمد للہ! میں ایک ماہ میں 20 ہزار کما لیتا ہوں۔" ادھر ہمارا ادنیٰ مدرس دو، تین یا پانچ ہزار ماہانہ وصول کرتا ہے۔ آپ بھی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلے کہ یہ اخراجات کا رونا رو رہا ہوگا، جبکہ عزت کے ساتھ مستقل بیٹھ کر صرف 5 ہزار پر پڑھانے والا عمرے بھی کر رہا ہے، گھر میں وسعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر طرح کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں۔

یہ واضح کر دوں کہ یہ بات بطور خاص ان مدرسین کے لیے کہی جا رہی ہے، جو کہیں مستقل ملازمت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ٹیوشن کا شغل بھی رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات کے لیے اپنے ادارے کا صحیح طور پر حق ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ رات کو ان کے صحیح وقت پر نہ سونے کی

وجہ سے، آرام پورا نہ ہونے کی وجہ سے اول تو صبح کو بروقت حاضری مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر آ بھی جائیں تو دوران تعلیم ان پر نیند غالب رہتی ہے۔ ناظمین کو چاہیے کہ مدرسین کی مصروفیات پر بھی نگاہ رکھیں۔

دوسری جانب وہ قراء جو کسی جگہ مستقل ملازم نہ ہوں، ان کے لیے گنجائش ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی عزت نفس کا خیال رکھیں۔ بچوں کی تربیت نماز وغیرہ کا بھی اہتمام کریں۔ نیز کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب ہرگز نہ کریں۔ کسی بالغ اور قریب البلوغ لڑکی کو پڑھانے سے قطعی اجتناب کریں۔

درست وضع قطع کا خیال نہ رکھنا

شعبہ حفظ میں کام کرنے والے عموماً نوجوان مدرسین ہوتے ہیں۔ یہ اس شعبے کی ضرورت بھی ہے۔ اس لیے کہ عمر رسیدہ اساتذہ کے کچھ طبعی تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ جم کر کام کر سکتے ہیں نہ وہ بہت زیادہ وقت نکال سکتے ہیں۔ سخت محنت بھی ان کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ لہٰذا نوعمر مدرسین جہاں اس شعبے کی ضرورت ہیں، وہیں وہ کئی وجوہ سے اس شعبے کے لیے بسا اوقات خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نوعمری کے زمانے کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے تقاضے تدریس کا خیال کرتے ہوئے دبا دینے ہوتے ہیں، مگر اکثر نوجوان اس میں ناکام رہتے ہیں۔ آج کل مدرسین میں دیکھا جا رہا ہے کہ موجودہ ماحول اور معاشرے سے متاثر ہو کر... ان کی وضع قطع... ان کا لباس... ان کی حجامت... جو ہمارے اسلاف کا ایک طریقہ تھا... ایک نمونہ تھا... وہ عمومی طور پر اس سے ہٹے ہوئے ہیں۔ میں جائز، ناجائز کی بات نہیں کر رہا۔ میں اسلاف کے نظریے اور طریقے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ایک مفتی کے پاس جائیں، وہ آپ کو کبھی نہیں کہے گا کہ کفوں والی قمیض پہننا جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض مفتی حضرات تو یہ بھی فتویٰ دیں گے کہ پینٹ، کوٹ پہننا بھی جائز ہے۔

آپ ذرا اس کا احساس پیدا کیجیے کہ آپ کا منصب کیا ہے؟ آپ کا منصب بڑا اونچا ہے۔ اس کی لاج رکھنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ کے سامنے 20 بچوں کی جماعت بیٹھی ہوئی ہے۔ ان سب کے انگریزی بال بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کفوں اور کالروں والی قمیصیں پہن رکھی ہیں۔ اگر آپ ان کی اصلاح چاہتے ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگنا ہوگا۔

آج کل دیکھا یہ جاتا ہے کہ حجام سے فرمائش کی جاتی ہے: ''ایسے طریقے سے بال بنانا کہ

جس مدرس کے دل میں یہ شوق گھسا ہوا ہے۔ انگریزیت کی محبت اس کے دماغ میں سرایت کیے ہوئے ہے، بھلا وہ اپنے ہیں بچوں کو یہ ترغیب دے سکتا ہے کہ بھئی! آپ کی حجامت ایسی ہونی چاہیے۔ آپ کا لباس ویسا ہونا چاہیے۔ وہ کبھی بات نہیں کرے گا، کیونکہ وہ خود اس کمزوری میں مبتلا ہے۔ اس لیے بھائی! ہمیں اس بات کا عہد کرنا ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے طریقے کو اپنانا ہے۔ شریعت میں بال رکھنے کے "مسنون طریقے" دو ہی آئے ہیں: یا تو پورے سر کا حلق کروائیں یا مکمل زلفیں رکھیں۔ (اگر بال کٹوانے ہیں تو سب برابر ہونے چاہییں۔ کچھ چھوٹے کچھ بڑے بینا جائز ہے۔) (أحسن الفتاوی، بفرق یسیر: 81/8)

اس کے علاوہ مختلف قسم کے "کٹ" جو آج کل رواج پا گئے ہیں، یہ سب ہماری حدود سے باہر کے ہیں۔ اس لیے ہم اس بات کا لازماً اہتمام کریں کہ ہماری وضع قطع شریعت کے اصولوں اور اکابر کے طریقے کے مطابق ہونی چاہیے۔ کفوں والی قمیض شریعت کی رو سے جائز ہے۔ مفتیان کرام یہی فتوی دیتے ہیں۔ لیکن ایک معلم اور مدرس کا لباس ویسا ہونا چاہیے، جیسا ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا۔ اسی میں عزت اور اسی کے اندر برکت ہے۔ اسی طرح ڈاڑھی کے حوالے سے بھی خوب محتاط رہیے۔ اس حوالے سے یہ مسئلہ یاد رکھیں: "چہرے پر چہرے کے تینوں اطراف ایک مٹھی کے برابر ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، ایک چاول برابر کم کروانا، کٹوانا، منڈوانا حرام ہے۔ جو بال ایک مشت سے زائد ہوں، ان کو کتروا دینا درست ہے۔"

بہرکیف! آپ بحیثیت ایک مدرس اور ایک مربی کے ہمیشہ سنت، سلف صالحین اور متقیوں کے رنگ میں ڈھلے رہیے۔ یہی آپ کے منصب کا تقاضا اور یہی آپ کے لیے ناگزیر ہے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے: "ہم وہ لوگ ہیں، جن کو اللہ نے اسلام کے ذریعے عزت عطا فرمائی ہے۔" (مصنف ابن ابی شیبه، جزء:4، ص:84، رقم الحدیث: 39)

لہٰذا اگر ہم شرعی قوانین سے باہر نکل رہے ہیں تو اس میں ہماری عزت ہرگز نہیں ہوسکتی۔ کوئی سمجھتا ہے تو یہ عزت کا دھوکہ ہے، عزت نہیں!

☆☆☆

غیر محتاط الفاظ بولنا

ہمارے نوجوان مدرسین میں کچھ غیر محتاط الفاظ بولنے کی عادت ہے۔اس کے ہم نے بڑے شدید نقصان دیکھے ہیں۔ بارہا ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑا کہ جو افراد بڑے "ہائی اسٹینڈرڈ" اسکولوں سے اپنے بچوں کو چھڑا کر لائے تھے، جب ان کے بیٹوں نے گھر جا کر بتایا کہ استادوں نے ہمیں یہ الفاظ کہے ہیں تو انہوں نے شکوہ و شکایت کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ انہوں نے براہِ راست کہا۔ مہربانی کر کے ہمارے بچوں کو فارغ کر دیں۔ ہم تو بڑے عزائم لے کر یہاں آئے تھے۔ یہ الفاظ جو بچوں نے ہمیں آ کر بتائے، یہ تو اسکول کے استاد بھی نہیں بولتے۔ بچے ایک دوسرے کو کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

جب ان سے کہا گیا: "بھئی! بتائیں تو سہی، انہوں نے کیا کہا؟"

وہ بتانا گوارا نہیں کرتے۔ اصرار کیا جاتا ہے کہ آپ تو بچوں کو ہٹا ہی رہے ہیں، بتا دیجیے تاکہ دیگر اساتذہ کو تنبیہ کر کے دوسرے بچوں کو اس سے بچا سکیں۔

کہتے ہیں: "استاد نے میرے بچے کو الو کا پٹھا کہا ہے۔"

"آپ خود ہی بتایئے اس کا کیا مطلب بنتا ہے؟ اس نے باپ کو تو الو بنا ہی دیا۔ پٹھا اولاد کے معنی میں آ گیا۔ لہٰذا اس نے ایک ہی زبان میں مجھے بھی گالی دی اور میرے بچے کو بھی گالی دی۔"

اپنے بچوں کو برا بھلا کہتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قِتَالُ الْمُسْلِمِ أَخَاهُ كُفْرٌ، وَسِبَابُهُ فِسْقٌ.... کسی مسلمان کو قتل کرنا کفر کی مانند، جبکہ اسے گالی دینا فسق اور کھلا گناہ ہے۔"(سنن الترمذی: 21/5، داراحیاء التراث، بیروت)

ایسا استاد جسے اپنی زبان پر قابو نہیں وہ بچے کی تربیت کیا کرے گا؟ یہ تو مدرسین کے

نزدیک ایک ہلکا سا لفظ ہے۔ استاد درسگاہ میں بچوں سے مخاطب ہو کر کہتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ، کتا، گدھا، خبیث.....اس قسم کے الفاظ تو کسی زمرے میں نہیں آتے۔ اسی طرح پر ''کتے کا بچہ'' بھی بعض کا تکیہ کلام بن چکا ہوتا ہے۔ ناراض نہ ہوں......آپ کی برادری کا ہی ایک فرد ہونے کے ناتے اپنے مشاہدات آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ جو کچھ میں نے سنا، یا مجھے کہیں دیکھنے کا موقع ملا، اس کی روشنی میں یہ چند گلے شکوے ہیں۔ ضروری نہیں یہ باتیں آپ میں بھی پائی جاتی ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ ان آلائشوں سے صاف ہوں۔ اللہ کرے، ہم سب ان چیزوں سے پاک ہو جائیں۔

بہر حال! خود ذرا کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر اس کا مراقبہ کریں۔ سوچیں کہ جو لوگ اتنے جذبات لے کر اپنے بچوں کو ہمارے ہاں داخل کرواتے ہیں، مگر پھر ہماری ہی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے متنفر ہو کر دوبارہ اسی معاشرے کا رخ کر لیتے ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

اور یہ تو بڑی ہی شرمناک بات ہے۔ ایک معلم کے پاس ایک طالب علم آیا ہے۔ اس کے والد اس کو چھوڑ گئے ہیں۔ معلم نے اسے غلط نظروں سے دیکھ لیا۔ دل میں غلط خیال رکھا یا زبان سے کوئی ناشائستہ اور اخلاق سے گری ہوئی بات کہہ دی۔ اب وہ گھر جا کر بات کرتا ہے کہ استاد جی نے یہ بات کہی ہے۔ ظاہر ہے وہ شخص تو اب بچے کو یہاں کبھی نہیں بھیجے گا۔ بچہ جو تعلیم سے محروم ہو گیا وہ اپنی جگہ، لیکن اس کا جو ذہن بن جائے گا، وہ سوچے گا کیا معلمینِ قرآن ایسے ہوتے ہیں؟ ان کے اخلاق اس قدر گرے ہوئے ہیں؟ ان کا کردار یہ ہوتا ہے؟ اور پھر وہ کتنے لوگوں تک یہ بات پہنچائے گا، اس نقصان کا ازالہ کون کرے گا؟؟

☆☆☆

موبائل فون کا بے جا استعمال

آج کے اس دور میں آزادی کی ہوا جہاں تمام طبقوں میں چل رہی ہے، مدرسین پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات واقع ہوئے ہیں۔ ایک استاد کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح پر دل و دماغ کی حاضری کے ساتھ درس گاہ کے لیے وقف کرنا آج جتنا بڑا مسئلہ ہے، اس سے پہلے نہیں تھا۔ ذہنی انتشار کے جتنے ذرائع آج میسّر ہیں، کبھی نہ تھے۔

ان میں سے آج کل کی سب سے بڑی مصیبت ''موبائل فون'' ہے۔ میں سمجھتا ہوں مدرسین کی تمام صلاحیتوں کو اس نے سلب کرلیا ہے۔ ایک حد تک یہ ضرورت بھی ہے اور مفید بھی۔ مگر تعلیم کے دوران مدرس کے پاس اس کا ہونا اور اس وقت میں اس کو استعمال میں لانا انتہائی خطرناک ہے۔ میں یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ بعض مدرسین محنت بھی کرتے ہیں۔ وقت بھی دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود درسگاہ میں ترقی نہیں ہے۔ منزلیں یاد نہیں ہیں۔ بچے تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

میں تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ اس کے پیچھے یہی چیز کارفرما ہے۔ اس معاملے میں بعض مدرسین میں یہاں تک بھی گراوٹ آگئی ہے کہ درس گاہ میں بیٹھ گئے ہیں، پڑھائی شروع ہو چکی ہے، لڑکوں کو کام میں لگا رکھا ہے، مگر خود ہمہ تن موبائل فون میں منہمک ہیں۔ کسی کا فون آیا، وہ سن لیا یا کہیں کرلیا، یہ تو ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہاں صورت حال بہت مختلف ہوتی ہے۔ اس وقت موبائل میں موجود دیگر خرافات، مثلاً: ویڈیو، آڈیو، انٹرنیٹ، ایس ایم ایس اور گیموں کے علاوہ واٹس ایپ اور فیس بک وغیرہ، وہ سب یہاں درس گاہ میں کھیلی اور استعمال کی جاتی ہیں۔ کرکٹ کی کمنٹری سننے کی وبا بھی عام ہوتی جارہی ہے۔

ہمیں اس قسم کی شکایات کافی موصول ہوتی ہیں۔ جب ایک مدرس اس چیز کو درسگاہ میں

ساتھ لے کر آئے گا، یہاں آ کر ان تمام چیزوں سے فائدہ اٹھائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی درس گاہ میں کیسے ترقی ہوگی؟ کیونکر وہ بچوں کی مقدار خواندگی کو متاثر ہونے سے بچا سکے گا؟ کیسے ایسا مدرس بچوں کو منزلیں یاد رکھوانے میں کامیاب ہوگا؟ اس لیے اول تو اساتذہ خود ہی اس چیز کا اہتمام فرمائیں۔ ایسی تمام غیر ضروری اور لایعنی خرافات سے مکمل اجتناب کی کوشش فرمائیں۔ ''بصورتِ دیگر'' ناظمین حضرات کوشش کر کے پابندی کے درجے میں یہ لاگو کریں کہ درس گاہ میں جانے سے پہلے مدرس اپنا موبائل فون دفتر نظامت میں جمع کرا دے۔ جب واپس جائے تو وہاں سے اسے واپس لیتا جائے۔ یا اس کے علاوہ ذمہ داران اپنے علاقے اور ادارے کے حالات کے اعتبار سے جو بھی اس کے لیے بہتر صورت مناسب خیال فرمائیں، وہ طے کر لیں۔

اس کے سنگین نتائج کے پیشِ نظر اس حوالے سے سختی کی ضرورت ہے۔ آپس کی بات ہے، خود ہی بتایئے! جس شخص کا تعلق اپنی درس گاہ سے اس قدر محدود ہو۔ اکثر وقت وہ دماغی طور پر باہر رہتا ہو، اس کا ذہن مسلسل گردش کر رہا ہو، کیا وہ درس گاہ میں بیٹھ کر تدریس کا حق ادا کر سکے گا؟ ہرگز نہیں کر سکتا! ہم جب اپنے بڑے حضرات کو دیکھتے ہیں، ان کے کاموں میں اتنی برکت تھی۔ ان کے پڑھائے ہوئے اتنے مضبوط ہوتے تھے کہ قرآن پاک خوب یاد ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کام اور صرف کام کے لیے یکسو کر لیا تھا۔ یہ بات نہیں کہ ہم میں قابلیت نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ صلاحیتیں تو موجود ہیں۔ طلبہ بھی نیک اور بات ماننے والے ہیں۔ لیکن جن چیزوں کا میں نے ذکر کیا، یہ آپ کے سکون اور یکسوئی... جو ایک مدرس کے لیے ضروری ہوتی ہیں.... کو برباد کرنے والی ہیں۔ ان چیزوں نے معیار کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ان لایعنی اور فضول کاموں سے اپنے آپ کو بچائیں اور طلبہ کی پہنچ سے بھی دور رکھیں۔

☆☆☆

غیر متعلقہ سرگرمیاں

ویسے تو آج کل موبائل آجانے کی وجہ سے خط و کتابت کا معمول کم ہو گیا ہے، تاہم پھر بھی بہت سے مدرس اپنی خط و کتابت کی عادت درس گاہ کے اوقات میں ہی پوری کرتے ہیں۔ اپنے کسی دوست کا خط آیا ہے، کسی عزیز نے انہیں یاد کیا ہے، گھر سے والدین نے خیریت دریافت کی ہے، اس قسم کے تمام خطوط کا جواب مدرس درس گاہ میں ہی لکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔

یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض اساتذہ کرام جب درسگاہ میں آتے ہیں تو اخباران کی جیب میں ہوتا ہے۔ آج کی تازہ خبریں پڑھنا ان کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس عادت کو پورا کرنے کے لیے کبھی تو ہوشیاری سے کام لے کر چھپ چھپا کر پڑھ لیتے ہیں۔ کبھی دلیری دکھاتے ہوئے اخبار کھول کر سامنے دھر لیتے ہیں۔ یہ فرضی باتیں نہیں بلکہ مشاہدات ہیں۔ اب جو مدرس صبح ہی سے ایسے جذبات لے کر درس گاہ میں داخل ہوا۔ کام کے آغاز سے ہی اس نے لائن سے ہٹ کر چلنا شروع کیا، اس کا سارا دن کس طرح گزرے گا؟ اس کے نتائج کس قسم کے ہوں گے؟ یہ کسی سے مخفی نہیں۔

آج کل مکاتب قرآنیہ میں درس گاہ کے اوقات کہیں صبح سے لے کر ظہر تک ہوتے ہیں تو کہیں چار بجے تک اور کسی جگہ عشا تک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اوقات اس کے پاس فارغ ہیں۔ اس طرح کے تمام کام عصر کے بعد یا عشا کے بعد بھی کیے جا سکتے ہیں، لیکن آج کا مدرس یہ سب کچھ درسگاہ کے وقت میں کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے.... ایک تو یہ ہے کہ ایسا مدرس غلطی کرے اور مانے بھی، مگر اس کا طرز عمل کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ یہ میرا حق ہے۔ موبائل رکھنا، بات چیت کرنا اور یہاں بیٹھ کے اخبار پڑھنا میرا حق ہے۔ اس سے مجھے کیوں روکا جاتا ہے؟ یہ وہ خطرناک چیزیں ہیں، جو مدرسین میں در آئی ہیں۔ یہ آج کل

کے تعلیمی حالات کو بگاڑنے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔

اسی طرح کمپیوٹر (لیپ ٹاپ/ ڈیسک ٹاپ) مدرسین میں عام ہونے لگا ہے۔ بہت سے معلمین اس کا شوق فرمانے لگے ہیں۔ اب اسکرین ایسی چیز ہے، جو خود نہیں تھکتی، آپ دیکھتے رہیں، وہ ساری رات بھی چلتی رہے گی۔ رات کے اوقات میں جب اس کا استعمال کیا جائے گا تو تہجد، فجر اور تعلیم لازماً متاثر ہو گی۔ پھر ہمارا تو شعبہ بھی ایسا ہے، جس میں کمپیوٹر کی کوئی ضرورت نہیں، ایسے آلات کو اپنے پاس رکھیں بھی نہیں، کیونکہ ایسی چیزوں کو اپنے پاس رکھنے کے بعد خود کو قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹر بیچنے والا چاہے جتنے بھی اس کے فضائل بیان کرے، نہ لیں۔ ان شاء اللہ! آپ کا مال، جان، وقت، آنکھ، دل اور ایمان سب محفوظ رہیں گے۔

یہ بات اصول کے درجے میں ذہن میں رکھ لیں:

''ایک مدرس اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ بچوں کے پورے وقت کو امانت نہ سمجھے۔ یہ احساس ہر وقت اس پر طاری رہے کہ بچوں کا ایک لمحہ ضایع کرنا اس کی طرف سے بڑی خیانت ہو گی۔''

جب مدرس اس بات کو پلے باندھ کر چلے گا کہ ذمہ داری کی خیانت، بدترین خیانت ہے اور یہ گناہ ہے تو یقیناً وہ کچھ نہ کچھ خیال کرے گا۔

☆☆☆

طلبہ سے خدمت لینا

استاد کی خدمت کرنا ہر طالب علم کی خواہش بھی ہوتی ہے اور اس کی تربیت کا حصہ بھی۔ اس لیے اسے بالکل ممنوع تو قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم اس میں بھی بسا اوقات بے اعتدالی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ پیش نظر رہے کہ بے ریش بچوں سے (جن کی داڑھی نہیں آئی) ہرگز خدمت نہ لی جائے۔ شیطان مردود کو اپنے پاس پھٹکنے کا موقع ہی نہ دیں۔ آدمی کو اپنی ذات پر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو، بدنامی کے دھبے سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجرِي مِنَ الاِنْسانِ مَجرَى الدَّمِ." (مصنف ابن ابی شیبة:480/15)

''بلاشبہ شیطان انسان کے اندر، رگوں میں خون کے دوڑنے کی طرح دوڑتا ہے۔''

اپنے اسلاف کے طرز عمل کو دیکھیے۔ حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خلوت خانے میں نابالغوں کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ (تحفة العلماء :139/2)

حضرت کے تقوی وطہارت کے مقام کو دیکھیے اور اپنے حال پر نظر کیجیے۔ اس سے بھی عظیم مثال حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ فقہ حنفی کے بہت بڑے امام حضرت امام محمد رحمہ اللہ بہت چھوٹی عمر میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس پڑھنے لگے تھے۔ آپ رحمہ اللہ بڑے حسین اور صاحب جمال تھے۔ ایک دن کتاب کھولے سامنے بیٹھے تھے کہ امام صاحب کی نظر ان پر پڑی۔ فرمایا: جب تک آپ کی داڑھی نہیں آجاتی آپ میرے پیچھے بیٹھ کر سبق پڑھا کرو! امام محمد نے ایسا ہی کیا۔ کسی روز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نظر اچانک پڑی تو دھوپ پڑنے کی وجہ سے امام محمد کی داڑھی کا سایہ نظر آیا۔ اس کے بعد امام صاحب نے امام محمد رحمہ اللہ کو سامنے بیٹھنے کی اجازت عطا فرمادی۔ (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حیرت انگیز واقعات:64)

غور کیجیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کس قدر احتیاط فرمائی۔ سالہا سال تک امام محمد جیسے ذہین شاگرد کو سامنے نہ بٹھایا۔ یہ اسی احتیاط اور تقوے کی ہی برکتیں تھیں کہ استاد بھی امام تھے اور فرماں بردار شاگرد بھی اپنے وقت کا امام بنا۔ شیطان آپ کو جتنے بھی مضبوط دلائل سے اس بات پر آمادہ کرے، آپ نے بس اسی بات کو سوچنا ہے کہ ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ آسان فرمائیں گے۔ اس کی برکت سے دین کی بڑی خدمت لیں گے۔

بڑے طلبہ میں سے بھی ان سے خدمت لیں جو اپنا کام پورا کرسکیں۔ کمزور طلبہ سے خدمت نہ لی جائے۔ ان کی علمی کمزوری کو دور کرنا یہ ہمارا پہلا فرض ہے۔ کسی بھی طالب علم سے خدمت لیں تو اس کی تعلیم کا بھی خوب خیال رکھیں۔ اب ایسی سوچ ہمارے مدرسین سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔ پہلے اساتذہ کا دستور تھا کہ تعلیم میں کمزور طلبہ سے خدمت نہ لیتے تھے۔ اب معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ کمزور طلبہ کو پڑھائی کے علاوہ ہر کام کے لیے فارغ رکھا جاتا ہے۔ مزید افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اگر ایک طالب سے استاد خدمت لیتے ہیں تو دوسرے اساتذہ بھی اسی سے خدمت لینا شروع کردیتے ہیں، تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہوجائے۔

ایک فارغ التحصیل طالب علم کا واقعہ سامنے آیا۔ جو علم میں کمزور رہ جانے پر اپنے ان اساتذہ سے نالاں تھا جو اسے خدمت پر مامور رکھتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں خدمت کے شوق میں امتحانات کے دنوں میں بھی کوئی خاص محنت نہ کرتا تھا۔ یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتا کہ استاد جی کی دعا سے میں پاس ہوجاؤں گا۔ یوں وہ خدمت کو محنت پر ترجیح دیتا رہا اور بعد میں استاد کے لیے نہایت برے جذبات پیدا ہوئے۔ اس لیے مدرسین، خدمت کے لیے ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر طالب علم کا انتخاب کیا کریں۔ کسی بھی طالب علم کی تعلیم کا حرج نہ ہونے پائے۔

یہ معمول بھی عام ہوتا جارہا ہے کوئی طالب علم خوش آواز ہے۔ تلاوت اچھی کرتا ہے۔ اسی طرح پر کوئی نعت اچھی پڑھ لیتا ہے۔ اس قسم کے بچے بھی انہی چیزوں کے لیے وقف رہتے

ہیں۔اس سے ان کی تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔تربیت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ منتظمین اور اساتذہ دونوں اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی بھی خارجی مصروفیت کی وجہ سے کسی طالب علم کے مقصداصلی تعلیم وتربیت کا نقصان تو نہیں ہو رہا؟اس بات کو تو بالکل ہی معیوب نہیں سمجھا جاتا کہ مہمانوں کی آمد پر ان کی خدمت کے سلسلے میں اساتذہ وطلبہ کی تعلیم یا تدریس کا حرج ہو رہا ہو۔درس گاہ کا بے دریغ وقت اسی میں صرف کردیا جاتا ہے۔یہ بالکل درست نہیں ہے۔

حضرت تھانویؒ کے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانویؒ کے پاس تشریف لائے۔حضرت نے اپنے استاذ محترم کی راحت وآرام کے مکمل انتظامات کیے۔جب تصنیف وتالیف کے معمول کا وقت آیا تو اپنے استاذ محترم سے اجازت چاہی کہ ''حضرت اس وقت کچھ لکھنے کا معمول ہے۔حضرت اجازت دیں تو کچھ لکھ لوں؟'' حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے بخوشی اجازت عطا فرمادی۔

اس واقعے کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند جیسی شخصیت مہمان بن کے آئی۔حضرت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ جیسا عظیم صفات والا انسان ان کے آداب کو بہتر سمجھتا تھا۔ مگر ان حضرات نے مہمانی ومیزبانی کی وجہ سے اپنے معمول اور تعلیم کا حرج نہ ہونے دیا۔ ہمارے مہمان حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اہم نہیں ہوسکتے اور نہ ہم حضرت تھانویؒ سے زیادہ مہمان کی اہمیت کو سمجھنے والے نہیں ہوسکتے۔لہٰذا استاد کی خدمت،نعت خوانی یا مہمان کی آمد کی خاطر بچے کی تعلیم اور اپنے معمول کا حرج کبھی نہ ہونے دیں۔

☆☆☆

مدرسے کے مال میں کمالِ احتیاط کی ضرورت

یہ وہ معاملہ ہے جس میں سب سے زیادہ خوفِ خدا کی ضرورت ہے۔ مدرسے کا مال طلبہ کی امانت ہے۔ اگر اس کے ایک روپے میں بھی کوئی کمی بیشی ہوگئی تو یاد رکھیے، قیامت کے دن جواب دہی انتہائی مشکل ہوگی۔ صرف ایک ایک روپے میں جانے کتنے لوگوں کا حق شامل ہوتا ہے۔ ذرا سوچیے، قیامت میں ان سب کا حساب کیسے چکائیں گے؟ اس کی وصولی سے لے کر صحیح مصرف میں خرچ کرنے تک پوری احتیاط اور دیانت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنے میں شریعت کی حدود کا لحاظ رکھیں۔ دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہ بھی ہوا تو قبر و حشر میں تو پوچھ ہے ہی۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے آپ بیتی میں لکھا ہے:

''اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ کا بہت مشہور مقولہ ہے کہ مجھے مدرسے کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا۔ اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک کے کام میں کچھ کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔ پھر ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہوئے یا مرتے وقت مالک سے معاف کرالے تو معاف ہوسکتا ہے لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور مزدوروں کے دو دو پیسے، ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے ہم سرپرستانِ مدرسہ اس کے مالک تو ہیں نہیں، امین ہیں۔ اگر اس مال کے اندر افراط و تفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے تو معاف نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے؟ اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمالے، لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر

کا معاملہ ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر کہ ان سے معاف نہیں کرایا جاسکتا۔" (آپ بیتی، شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ، حصہ اول، ص:34)

لہٰذا مالی حوالے سے طلبہ، اساتذہ، منتظمین، مہتممین اور عملے کے تمام افراد کو خصوصی طور پر فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ تدریس میں محنت اور وقف کے اموال میں دیانت دونوں کا پلہ ایک ساتھ تھامے ہوئے چلیں گے تو ان شاء اللہ کامیابیوں کا سفر جنت تک بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہوتا چلا جائے گا۔

تمام شعبوں کے مابین اتحاد کی ضرورت

ایک بات ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں بٹھالیں۔ یہ مت سمجھیں کہ جو کام میں کر رہا ہوں، صرف وہی دین کا کام ہے، باقی سب غیر اہم یا کم اہم ہیں۔ اگر کوئی مدرس یا مہتمم یہ سمجھ لے کہ دین کا کام تو بس یہی ہے، جو میں کر رہا ہوں، باقی شعبے تبلیغ، جہاد یا دیگر...... وہ تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں، تو یہ بہت بڑی نا سمجھی ہوگی۔ ایسا مدرس یا مہتمم بہت بڑی غلطی میں مبتلا ہے۔

اس لیے مدرسین کو چاہیے کہ کبھی کبھی تبلیغی جماعت میں ضرور نکلا کریں۔ ان کے تعلیم کے حلقوں میں بیٹھیں۔ تعطیلات میں اس کی ضرور کوشش کریں۔ جمعرات کی چھٹی میں چوبیس گھنٹے کے لیے نکلیں۔ اس کے جو فضائل اور اجر و ثواب ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے ہی، ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ نفس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ مزاج میں جو کچھ بڑائی کا احساس ہوتا ہے، اس سے ختم ہوگا۔ گشت کرنے سے لوگوں کے دینی احوال کا اندازہ ہوگا، طبیعت میں عاجزی پیدا ہوگی۔ اس سے بھی بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نیک کاموں کی عادت پختہ ہوتی ہے۔ سنن و نوافل کا شوق بڑھتا ہے۔

اس سب سے بڑھ کر یہ کہ دین کے ایک شعبے کے ساتھ دوسرے شعبے کی ہم آہنگی پیدا ہو گی۔ آپس میں محبت پیدا ہوگی۔ ان حضرات کی حوصلہ افزائی ہوگی، انہیں یقین ہو جائے گا کہ آپ مدرسین بھی ان کے کام کو اہمیت دیتے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک ایسا کام جو آپ بغیر دقت کے کر سکتے ہیں، وہ ان جماعتوں کی نصرت اور اکرام ہے۔ آپ کی مسجد، مدرسے یا محلے میں جماعت آئی ہوئی ہو، ان کا اکرام ضرور کریں۔ "اِکرام" کا یہ مطلب نہیں کہ لازماً کھانے پکوائے جائیں، بلکہ ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے مل لینا، تعارف کر لینا اور تعلیم کے حلقے میں

بیٹھ جانا بھی اکرام ہے۔

بالخصوص باہر سے آئی ہوئی مہمان جماعتوں کو ضرور ملیں۔امیر صاحب سے مل کر ان کے جملہ حال احوال معلوم کریں۔ محلے دار ہونے کے ناتے کام کے حوالے سے ان کی ''نصرت'' کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت دے رکھی ہے تو کھانے پینے کے ذریعے اکرام کریں۔ اسی سے اکرام والی سنت بھی ادا ہوگی اور آپ کے شاگردوں کو بھی ایک اچھا پیغام اور سبق ملے گا۔ نیز تبلیغ والوں کے ذہنوں میں مدرسین اور معلمین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوگی تو وہ بھی دور ہو جائے گی۔

دوسری جانب تبلیغی جماعت کے حضرات بھی یہ ہرگز نہ سمجھا کریں کہ دین کا کام صرف اور صرف تبلیغ ہی ہے، باقی سب بے کار ہے۔ گویا یہ کشتیِ نوح ہے، جو اس میں نہیں بیٹھے گا، وہ غرق ہوگا۔ یاد رکھیے! دین کی حفاظت واشاعت کے بے شمار کام ہیں۔ اس کے بعد پھر تقسیم کار ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو جس شعبے کی خدمت کے لیے قبول فرمائے، یہ اللہ کی مرضی اور اُس کا انتخاب ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے عطا ہونے والی سعادت ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ''رفیق'' بنیں، ''رقیب'' نہ بنیں۔ باہم اختلافات اور غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں، جب ایک دوسرے کے قول وفعل کی نفی شروع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اسلامی سرحدوں کے محافظ، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جان کی قربانی دینے والے مجاہدین بھی اللہ کے حکم سے اس راستے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی یہ نہ سوچیں کہ تبلیغ والے اور مدرسین بے کار بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، لیکن اگر وہ یہ سوچ لیں کہ ہم نہ ہوتے تو یہ سب لوگ نہ جانے کہاں ہوتے......تو ان کا یہ خیال بھی غلط ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ دین کے یہ تمام شعبے زمانہ نبوت سے ہی جاری ہیں۔ یہ تمام شعبے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمائے۔ سب کو اہمیت دی، سب کی نگرانی فرمائی، مسجد نبوی میں جمعہ پڑھایا تو اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کو درس بھی دیا۔ ایک جانب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

کو یمن بھیجا تو دوسری طرف میدان احد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفیں بھی ترتیب دیں۔
پھر آپ اپنے اکابر کو دیکھیے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف اولیاء کے سردار ہیں تو دوسری جانب 1857ء کے جہاد آزادی میں سالار بھی ہیں۔ اسی طرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں تو ساتھ ہی فضائل اعمال اور فضائل صدقات کے مصنف بھی ہیں۔

ہر معاملے میں ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ دین کے جتنے بھی طبقات ہیں، ان میں آپس میں اتحاد ہو، اتفاق ہو۔ کہیں بھی اختلاف کی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔ اپنے کام میں مقدور بھر کوشش کریں، باقی معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی پُر خلوص کوشش اور محنت کو ضائع نہیں فرماتے۔ اس عمل اور کوشش کے باوجود اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آپ اعتراض کرنے والے کی بات خندہ پیشانی سے سن لیں۔ ان سے کہیں: ''جی آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' بس یہ سوچ لیجیے کہ یہ ان کے جذبات واحساسات ہیں، یہ ان کی سوچ ہے، کسی کے کہنے سے کوئی غلط نہیں ہو جاتا۔ آپ کی تسلی اور اطمینان کے لیے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کافی ہونا چاہیے: '' خیر کم من تعلم القران و علمہ'' (سنن ابن ماجة: 19، قدیمی) ''تم میں سے بہترین لوگ قرآن پڑھنے اور پڑھانے والے ہیں۔'' اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

اس طرح کی باتوں کو آپ ''شکایت'' نہ سمجھیں، ایک ''دوستانہ شکوہ'' سمجھ لیا کریں۔ پھر جس حد تک میں نے نشان دہی کی ہے، اسی طریقے سے تعاون کر دیا کریں۔ یوں آپ کا یہ طرز عمل ''جوابِ شکوہ'' ہو جائے گا۔ اگر ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی پالیسی اپنائے گا تو تمام دین دار طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہو کر ''رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ'' کا نمونہ سامنے آئے گا۔ بس اسی طرح ''فضائے بدر'' پیدا ہو گی تو سب کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل حال ہو گی۔ نصرت ہو گی، برکت ہو گی۔

☆☆☆

خوش گوار تدریسی زندگی کے اصول

میں نے مدرسین کے آپس کے مسائل میں غور کیا تو نتیجہ یہ نکالا کہ اگر تدریسی زندگی میں ایک مدرس ان تین باتوں پر عمل کر لے تو کبھی کوئی شکوہ شکایت پیدا نہ ہو:

1) جس مدرسے میں تدریس کریں، جب تک آپ سے کسی معاملے میں رائے یا مشورہ طلب نہ کیا جائے، کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کریں۔ جب پوچھا جائے تو جو سمجھ میں آئے، دیانت کا خیال رکھتے ہوئے ان کے سامنے عرض کر دیں۔

2) کسی دوسرے استاد کی ہرگز کوئی خوبی یا خامی بیان نہ کریں۔ جی ہاں! خامی اور نہ ہی خوبی۔ طلبہ کے سامنے، نہ ہی کسی دوسرے مدرس کے سامنے۔ مجمع میں اور نہ ہی کسی نجی مجلس میں۔ خامی تو بیان کرنی ہی نہیں چاہیے۔ خوبی کا اظہار کرنے سے بھی اس لیے گریز کیا جائے کہ جب ایک شخص دوسرے کا وصف بیان کرتا ہے تو برائی کا راستہ خود بخود نکل آتا ہے۔ ممکن ہے آپ کی رائے سے کوئی دوسرا شخص متفق نہ ہو۔ وہ اس کی برائی بیان کرنے لگے یا اس کی وجہ سے کسی اور میں حسد اور رقابت کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ نیز اور کوئی نقصان ہو یا نہ ہو، آپ خود ہی اس کی زد میں آسکتے ہیں۔ کسی بھی وجہ سے آپ کی اس رائے سے متفق نہ ہونے والا آپ کی مخالفت ضرور کرے گا۔ اس لیے دوسرے استاد کی خوبی یا خامی دونوں بیان کرنے سے قطعی گریز کیا جائے۔

3) یہ بات آپ کے لیے کئی لحاظ سے بہت مفید رہے گی کہ اپنے ساتھ پڑھانے والے مدرسین کا کبھی کبھی حسبِ استطاعت اکرام کر دیا کریں۔

میں نے جنھیں یہ باتیں بتائیں اور انھوں نے ان پر عمل کیا، پھر آکر مجھے بتایا: ''ان باتوں پر عمل کر کے ہم ان تمام مسائل سے بحمد اللہ محفوظ رہے، جو تدریسی زندگی میں ایک مدرس، اور مہتمم، دیگر اساتذہ اور طلبہ کے درمیان، عام طور پر پیش آتے ہیں۔''

چوتھا باب

تحفیظِ قرآن کے راہنما اصول

(ابتدائی قاعدے سے فارغ التحصیل ہونے تک)

ابتدائی قاعدہ

پہلی بات:

"قاعدہ" پڑھانے کا مقصد بچے کے اندر یہ استعداد پیدا کرنا ہے کہ وہ قرآن پاک کے الفاظ کے ہجے کر سکے اور حروف کو ان کے مخارج سے صحیح طریقے سے ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔ حفظ کے شعبے میں بنیادی مشق کا یہ کام ذرا محنت طلب ہوتا ہے۔ طالب علم کو بار بار "کہلوانا" پڑتا ہے۔ صرف طریقہ بتا دینا کہ بھئی! اس طرح ادا کرلو، ہجے کرنے کا قاعدہ یہ ہے، وغیرہ..... اس طرح بچہ کبھی ادا نہیں کر سکے گا۔ اس کی ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس مثال کے طور پر 20 بچے ہیں۔ ان بیس میں سے آپ نے محنت کر کے پانچ کو تیار کرلیا ہے۔ اب آپ ان کو اپنا معاون بنا سکتے ہیں۔

اس کی صورت یہ ہے، مثلاً: ایک بچے کو آپ نے "ت، ث، ح" بالکل صحیح کروا دی ہے۔ چند دوسرے طلبا ہیں جو ابھی تک ان حروف کی صحیح ادائیگی پر قادر نہیں ہو سکے۔ اب پہلی قسم کے بچوں میں سے ایک کو اپنے پاس بٹھالیں اور جن کی تصحیح کروانی ہے، ان میں سے ایک، دو یا تین کو اس کے پاس بٹھا دیں۔ وہ بیٹھ کے ان سب کو کہلواتا رہے۔ جب بچہ بار بار صحیح تلفظ کے ساتھ ایک حرف کو سنے گا، پھر متعدد مرتبہ خود کہے گا تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑی دیر یا کچھ ہی عرصے کے بعد مختصر سی محنت کے نتیجے میں اپنی کمزوری پر قابو پالے گا۔ اس طالب علم کے حروف کی ادائیگی بالکل صحیح ہو جائے گی۔

دوسری بات:

آج عام طور پر استاد کے اوپر یہ بات غالب ہوتی ہے کہ بچے کو سبق دے دیا اور پنسل سے

نشان لگا دیا۔ ایک دو دفعہ کہلوا دیا: "ب، ت، ث، ج، ح"

پھر کہہ دیا: ''چلو بھئی! یاد کرو جا کے۔''

اب بچہ جا کر بیٹھ گیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں ہے میں نے کیا کرنا ہے؟ کھیل رہا ہے۔ لاپروائی سے کبھی اِدھر، کبھی اُدھر دیکھ رہا ہے۔ دو چار گھنٹے کے بعد استاد اس کو بلائے گا:

''ہاں بھئی سناؤ!''

بتایئے! کیا اب اسے یاد ہوگا؟ اسے بالکل یاد نہیں ہوگا۔

لہٰذا اس کو مصروف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے جن بچوں کی ادائیگی بالکل صحیح ہو چکی ہے، اسے ان کے ساتھ جوڑ دو۔ وہ انہیں کہلواتا رہے گا، یہ کہتے رہیں گے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ان بچوں کا وقت ضائع نہیں ہوگا، قیمتی بنے گا۔ دوسرا ایسا بچہ کھیلنے اور درسگاہ کا ماحول خراب کرنے سے باز رہے گا۔ تیسرا، ایک یا دو گھنٹے کے بعد جب آپ اسے بلائیں گے تو صحیح یاد ہونے پر آپ کو ناراضگی اور ناگواری بھی نہیں ہوگی اور وہ ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ رہے گا۔

پہلی صورت میں جب آپ نے اسے کلاس میں اپنے حال پر چھوڑ دیا، پھر سبق یاد نہ کرنے، شرارتیں کرنے اور درسگاہ کا ماحول خراب کرنے پر آپ ناراض ہو رہے ہیں تو اس میں بچے کا قصور نہیں ہے۔ یہ کوتاہی خود استاد کی ہے کہ اس نے بچے سے صحیح طریقے سے کام کیوں نہیں لیا۔

الغرض! ابتدائی قاعدہ پڑھانے اور نئے پرانے طلبہ کو لے کر چلنے کے حوالے سے یہ دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجیے۔

☆☆☆

ناظرہ پڑھنے کی استعداد پیدا کرنا

پہلی ہدایت:

''قاعدہ'' ختم ہوتے ہی آپ بچے کو پارہ عم شروع کروائیں گے۔اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس چیز کو یقینی بنائیں کہ بچے کا پورا قرآن پاک، نہیں تو کم سے کم ایک یا دو پارے مکمل ہجوں اور جوڑوں کے ساتھ نکلوائیں۔مثال کے طور پر ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم''، ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے جوڑ پوری طرح کروائیں۔اس ابتدائی مشق کے نتیجے میں اگر محسوس ہو کہ طالب علم جوڑ اٹھانے اور ہجا کرنے میں ناکام ہے تو سمجھ لو کہ استاد نے قاعدے پر صحیح محنت نہیں کی ہے۔[قال العلامة الجزری رحمه الله تعالی: ولیس بینه[التجوید]و بین ترکه - الا ریاضةامرئ بفکه. (المقدمة الجزرية، باب معرفة التجويد:8)]

اب اس کا یہ حل نہیں کہ بچے کو دوبارہ سے قاعدے پر لگا دو۔اس سے بچہ بھی بد دل ہو جائے گا۔والدین کے جذبات کو بھی ٹھیس پہنچے گی۔وہ سوچنے پر مجبور ہوں گے اتنے مہینے کے بعد تو بچے نے قاعدہ ختم کیا ہے۔پھر پارہ شروع کروایا گیا، مگر اسے جوڑ نہیں آرہے۔اب دوبارہ یہ قاعدے پر لگ جائے گا۔

اس کا حل یہ ہے کہ اسے یہ کہا جائے آپ کا قاعدہ تو الحمد للہ مکمل ہو گیا ہے، مگر ہم پارہ شروع کرنے سے پہلے دو، تین تختیوں کی آپ کو دوبارہ مشق کروانا چاہتے ہیں۔اس کے بعد اسے پہلے حرکات کی بنیادی تختی کی مشق کروائیں۔اس کے بعد تنوین کی تختی پر محنت کروائیں۔پھر حرکات، تنوین کی مشق جس تختی میں ہے، اس پر تھوڑی سی محنت کروائیں۔ان تین تختیوں کے بعد قرآن پاک پر ہجے کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ان شاء اللہ تعالی۔

دوسری ہدایت:

کسی بھی بچے کا قاعدہ پورے ہونے پر قرآن پاک پر اس کے ہجے کروانا ضروری ہے۔ جو مدرس ہجے کروائے بغیر آگے لے کر چلتا ہے، وہ یہ یقین کر لے کہ طالب علم پورے 10 پارے بھی حفظ کر لے، اس کے اندر یہ استعداد پیدا نہیں ہو سکے گی کہ بچے کو کسی نئی جگہ سے نکال کر پڑھنے کے لیے کہا جائے اور وہ اسے اپنے آپ پڑھ سکے۔ ایسے بہت سے بچے دیکھے، جنہیں دس پارے پورے ہونے کے باوجود گیارہویں پارے سے پڑھنے کے لیے کہا گیا، مگر وہ ایک سطر نہ پڑھ سکے۔

تیسری ہدایت:

سبق حفظ یاد کرنے سے پہلے بچے کو ناظرہ اچھی طرح یاد کروانا....تاکہ کہیں بے دھیانی میں غلط طریقے سے نہ رٹ لے.... نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اسے قرّاء کی اصطلاح میں ''مطالعہ نکالنا'' کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے عام طور پر دو طریقے رائج ہیں:

بعض جگہ تو قاعدے کے بعد آدھا پارہ یا ایک پارہ پڑھنے کے بعد پہلے پورا قرآن پاک ''ناظرہ'' پڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی مفید ہے۔ اچھا ہے، لیکن اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بچے کے اندر ابتدائی استعداد پیدا نہیں کی گئی ہوتی۔ اگر ہجا کے ساتھ قاعدہ پوری محنت سے پڑھا کر استعداد مضبوط کر لی جائے، اس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ پہلے ایک لمبا عرصہ خرچ کر کے ناظرہ قرآن پاک نہیں پڑھانا پڑتا۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہر روز کے سبق کو ساتھ ساتھ مطالعے کے ذریعے حل کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔

چوتھی ہدایت:

آج کل جو ایک نئی صورت اور پیدا ہوگئی ہے کہ بعض پارے مارکیٹ میں ایسے آگئے ہیں، ان میں کچھ نشانات دیے ہوئے ہیں۔ فلاں رنگ حرف کے ''پُر'' ہونے کی علامت ہے۔ فلاں رنگ جہاں لگایا گیا ہے، یہ حرف ''باریک'' ہوگا۔ فلاں جگہ ایسی علامت ہوگی تو یہاں ''غنہ'' کیا

جائے گا۔ اس چیز نے تو استاد کی محنت کی عادت کو بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ استاد اتنا کہہ کر فارغ ہو جاتا ہے: ''دیکھو بھئی! جہاں یہ نشان ہو، وہاں غنہ کر لینا اور جس جگہ یہ علامت ہو وہاں حرف کو ''پُر'' پڑھ لینا، وغیرہ۔''

اتنا کہنے کے بعد استاد سمجھتا ہے، اب میری کوئی ذمہ داری نہیں رہی۔ نشانات کے مطابق بچہ خود ہی سمجھ لے گا۔ اس بارے میں ہر ایک کا نظریہ اپنا اپنا ہو سکتا ہے۔ میرا نکتہ نظر اس بارے میں یہ ہے کہ اس قسم کے قاعدے، پارے اور قرآن پاک مارکیٹ میں آنے کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں بچوں کی استعداد بالکل ختم ہو رہی ہے۔

لہٰذا حفظ کے بچوں کو ایسے قرآن پاک پر پڑھنے سے منع کرنا چاہیے۔ ناظمین اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ مدرسین کرام کو بچوں کے لیے سادہ قاعدے اور پارے مہیا کیے جائیں۔ ایسے قرآن پاک کو حفظ کے بچوں کے لیے ممنوع قرار دیا جائے جن میں مختلف رنگوں کے ذریعے غنہ، باریک، پُر حروف اور قلقلہ وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہو۔

پانچویں ہدایت:

سادہ قرآن پاک یا پاروں پر ناظرہ نکلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے مثال کے طور پر شروع کرایا: ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' آپ دو مختلف رنگوں کی پنسلیں ہاتھ میں لیں۔ ہمارے ہاں نیلی اور سرخ پنسل کا رواج ہے۔ ''پُر'' حرف پر سرخ نشان لگایا جاتا ہے۔ ''باریک'' کی نشاندہی کے لیے حرف پر نیلے رنگ کے ساتھ علامت لگائی جاتی ہے۔ جہاں غنہ بتانا مقصود ہو، وہاں ایک کانٹے کا نشان لگا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح اپنی صوابدید سے کوئی بھی طریقہ اختیار کرتے ہوئے پہلے استاد خود نشان لگائے۔ اس دوران بچہ اسے دیکھ رہا ہو، استاد بچے کو سمجھاتا اور تربیت دیتا رہے۔ ایک پاؤ تک ہر چیز بتا کر خود نشان لگانے کے بعد بچے سے کہے:

''لو بھئی! ایک پاؤ میں نے حل کروا دیا ہے، اب اگلی ایک سطر کے نشان خود لگاؤ کہ کون سا حرف باریک ہے، کون سا ''پُر'' ہے، کہاں غنہ ہے اور کہاں پر نہیں ہے؟''

اس بچے سے ایک پارے کے ختم تک اسی طرح پر نشانات لگواتا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بچہ جس کو عمومی طور پر تجوید کے مسائل کا پتہ نہیں ہے، موٹی موٹی دو چار چیزیں بتانے کے بعد وہ ہر حرف کے بارے میں بذاتِ خود فیصلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

جب استاد کی توجہ اور محنت سے بچے کی مسلسل کوشش کے بعد اس میں یہ استعداد پیدا ہو گئی تو اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بچہ خود بخود چلنے لگے گا۔ ہر مطالعے کے وقت آدھا آدھا گھنٹہ صرف کرنے اور زیادہ مشقت اٹھانے کے بجائے شروع میں اچھی طرح محنت کروادی جائے تو یہ استعداد آخر تک کام آتی رہے گی۔

چھٹی ہدایت:

بعض بچے......سو میں سے کوئی دو......ایسے ہوتے ہیں کہ ایک پارہ، ہجا سے پڑھنے کے بعد بھی ان کے اندر یہ استعداد پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آگے مطالعہ نکال سکیں۔ ایسی صورت میں آپ دوسرا پارہ بھی اسی طرز پر نکلوائیں۔ ایک پارے پر بس نہ کریں۔ ہمارے پاس بعض بچے ایسے بھی آئے کہ ہم نے ان کو پانچ، پانچ پارے ہجا سے پڑھائے تب جا کر ان کے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا ہوئی کہ وہ خود بخود قرآن پاک کا مطالعہ نکال سکیں۔

مطالعہ پڑھانا

طریقہ:

بچے کو جتنا بھی سبق دینا مقصود ہو، چار سطریں یا پانچ سطریں، ان پر پہلے نشانات لگائے جائیں۔ پھر آپ کے طلبہ میں سے جو ہوشیار ہیں، جو اس کام پر آچکے ہیں۔ اور ان کا اپنا کام بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ ان کے سامنے دو، چار بچوں کو بٹھادیں۔ پہلے والے بچوں سے کہیں کہ تین، چار سطروں کے جوڑ ان بچوں کے سن کر لائیں۔ صرف جوڑ نہیں، بلکہ ایک آیت کے جوڑ کرانے کے بعد وہ اس کو رواں بھی پوری طرح پڑھے۔ جب اس کا ''جوڑ'' اور ''رواں'' چار سطروں کا پورا ہو جائے تو ایک، دو بچے اپنے پاس ایسے رکھیں کہ وہ ان کا ''رواں'' سنیں اور جو غلطی ہے غنے کی، مد کی یا باریک کی.... اس کی نشاندہی کر کے لائیں۔ جب اتنا کام ہو جائے، اس کے بعد وہ بچہ استاد کے پاس مطالعہ پڑھنے کے لیے آئے.... یعنی.... استاد تک آنے کے لیے دو مرحلوں سے پہلے گزر کر آئے۔ پھر استاد اس کا سنے۔ اگر پیچھے ان دونوں کے پاس کوئی غلطی رہ گئی ہے تو اس کی نشاندہی کرے۔ اس کے بعد استاد باقاعدہ اس سبق کو کہلوائے۔ بچے سے کہے:

''جو میں کہلوا رہا ہوں، وہاں پر تیری نظر بھی ہو۔''

''تیری انگلی بھی وہاں پر ہو اور اس کو دھیان سے سن!''

اتنا کام کرنے کے بعد وہ بچے سے کہے:

''اب اس سبق کو تین دفعہ یہاں بیٹھ کر کہو۔''

بیداری کا ثبوت دیں:

مقصد یہ ہے کہ بچے کو آگے جو سبق دینا ہے، اس سے پہلے کہ بچہ اسے یاد کرنا شروع

کرے، اس کا ناظرہ اتنا صحیح ہو جائے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی کی گنجائش نہ رہے۔ نہ حرفوں کی، نہ زیر، زبر کی۔ نہ ہی کوئی اور پختہ غلطی۔ اگر آپ نے مطالعے میں اس کی غلطیاں باقی رہنے دیں تو آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ بچہ اس کو تھوڑے ہی وقت میں کس قدر پختہ کر لے گا، پھر زندگی بھر کے لیے اس غلطی میں مبتلا رہنے کا اندیشہ ہے۔

بچے کو سبق یاد کرنے کے لیے کئی کئی دفعہ ایک ہی آیت کو دہرانا پڑتا ہے۔ بیس بیس اور چالیس چالیس مرتبہ۔ اگر اس کا پہلے سے غلط یاد ہے تو جب وہ اسے زبانی یاد کرنا شروع کرے گا تو اس کی وہ غلطی بالکل... مکمل... پختہ اس کے ذہن میں بیٹھ جائے گی۔ یہ حفظ کے شعبے میں اتنا بڑا نقصان ہوتا ہے کہ اس کا ازالہ بعض دفعہ تو پوری زندگی نہیں ہوتا۔

بہرحال! مطالعہ پڑھانے کے اس مذکورہ طریقے کو مضبوطی کے ساتھ اپنانے کی ضرورت ہے... لیکن افسوس! آج استاد اس پر پورا نہیں اتر رہے۔

☆☆☆

حفظ کروانا

مختلف استعداد کے طلبہ:

سبق یاد کرنے میں بچوں کے ذہن مختلف ہیں۔ بعض بچے با صلاحیت ہوتے ہیں۔ انہیں طریقہ بتا دو کہ اس طرح سبق یاد کرنا ہے، وہ خود بخود سبق یاد کر کے سنا دیتے ہیں۔ دوسرے بعض وہ ہوتے ہیں جو صبح سے لے کر شام تک، رات سے لے کر صبح تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ خود سبق یاد کرتے ہی نہیں۔ وہ کوشش کر کے بھی یاد کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ایسے طلبہ کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس قسم کے بچوں کے لیے ہم جس کامیاب تجربے سے گزرے اور انہیں یاد کروایا وہ کچھ اس طرح ہے:

ایسے بچوں کو عام طریقے سے ہٹ کر اپنے پاس بٹھا لیا جائے۔ ایک سطر کے تین چار حصے کر کے تھوڑا سا یاد کروایا جائے، مثلاً: "تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" بس اتنا ہی اسے یاد کروا دیا۔ آپ کے بار بار کہلوانے سے اسے یاد ہو گیا۔ اب اسے کہیں کہ تین چار دفعہ دیکھ کر دہرائے۔ پانچ، چھ دفعہ زبانی کہے۔ جب اسے پورا اچھی طرح یاد ہو جائے تو اس کا سنو۔ وہ آپ کے پاس آ کر اونچی آواز سے سنائے۔

اب اسی آیت کے اگلے ٹکڑے کے طرف بڑھ جایئے! اسے کہیں: دیکھو! آگے کیا ہے؟ وہ آپ کو پڑھ کر سنائے گا: " وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْ ءٍ قَدِیْر " اسے کہے کہ تین دفعہ اسے دیکھ کر پڑھے۔ جب یاد کر لے تو اب دونوں ٹکڑوں کو ملا کر یاد کرنے کا حکم دیں۔ پھر ملا کر اس سے سنیں۔ اس کے بعد یہی عمل اگلی چند آیتوں تک جاری رہے۔ اس قدر یاد کروانے کے بعد اس پر لازم کریں کہ اسی طریقے کے مطابق سبق کو مکمل کر لے۔

مشکل، مگر مفید:

آپ کہیں گے یہ تو بڑا مشکل نسخہ بتایا جا رہا ہے، ایسا تو ہم سے نہیں ہوگا۔ لیکن بعض مریضوں کو کڑوی دوا پلانی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کام چلتا نہیں ہے۔ ایسے بچے پر ایک بار آپ کو مسلط ہونا پڑے گا۔ اگر استاد مسلط نہیں ہوگا تو یہ بچہ بالکل سبق یاد نہیں کرے گا۔ اس طرح کے بچوں کو اگر اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی جگہ پر 4 سطریں، 4 گھنٹے میں بھی یاد نہیں کرے گا، تاہم اگر آپ انہیں مذکورہ طریقے کے مطابق سبق یاد کروائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بچہ جو چار گھنٹے بعد سبق سنانے کے لیے آتا ہے، آپ کو آدھے گھنٹے میں لا کر سنا دے گا۔

آپ ایک، دو ہفتہ اس کے ساتھ اسی طرح پر محنت کریں۔ اس سے اس کو سبق یاد کرنے کا طریقہ آجائے گا۔ اسے پتہ چل جائے گا کہ میں نے سبق کیسے یاد کرنا ہے۔ اسے احساس ہو جائے گا کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھتا ہوں، مجھے 4 گھنٹے میں سبق یاد نہیں ہوتا اور یہاں میرا آدھے گھنٹے میں یاد ہوگیا۔ اسے استاد کہہ دے کہ تو وہاں پر بیٹھ کر توجہ سے یاد نہیں کرتا۔ اسی لیے تجھے یاد نہیں ہوتا۔ یہاں تیرا آدھے گھنٹے میں کیسے یاد ہوگیا؟

اس جز وقتی محنت کی وجہ سے طالب علم.... ان شاء اللہ.... جب لائن پر آجائے گا تو اب جب تک وہ بچہ حفظ کرتا رہے گا، استاد کو آسانی رہے گی، چنانچہ آج جو استادوں کو دیکھا جاتا ہے کہ شروع سے آخر تک بچے کے ساتھ کھپ رہے ہیں، مگر بچہ پھر بھی لائن پر نہیں آتا، اس کی بنیادی وجہ ابتدائی محنت کی کمی ہوتی ہے۔

کمزور طلبہ۔ آزمائش بھی، نعمت بھی:

بے شک یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ نے انسانوں کے رنگ، زبان وغیرہ اعضا مختلف بنائے ہیں اور ان کو اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ (سورہ روم)، بعینہٖ اسی طرح ذہن، حافظے اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی لوگوں اور بچوں کو مختلف بنایا ہے۔ مثلاً 30 بچوں کی کلاس میں 25 بچے بالکل درست اور استاد کی عین منشا کے

مطابق چل رہے ہیں اور کام پورا کرتے ہیں، لیکن 5 بچے اسی قدر محنت وتوجہ کے باوجود نہیں چل رہے۔ استاد کو پریشان کیا ہوا ہے۔ ان کی وجہ سے استاد کی درسگاہ کا نتیجہ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ نظام بھی حق تعالیٰ کی عین حکمت وشفقت پر مبنی ہے۔ استاد کے دماغ کو ٹھکانے اور متوازن رکھنے کی اللہ ہی کی طرف سے یہ ایک تدبیر ہے۔

اگر کلاس کا نتیجہ سو فیصد ہوتا اور سو فیصد طلبا ہر لحاظ سے اعلیٰ اور فائق ہوتے تو خطرہ تھا کہ استاد کو اپنی سو فیصد تعلیم وتربیت پر ناز ہوتا، جس کی وجہ سے ڈر تھا کہ استاد تکبر کا شکار ہو جاتا اور اللہ کی طرف رجوع میں کمی واقع ہو جاتی۔ اب جبکہ 5 طلبا نے استاد کو پریشان کیا ہوا ہے، استاد کی تمام تدابیر ناکام ہو رہی ہیں تو یقیناً استاد کے دل میں یہ بات آنی چاہیے کہ جو 25 طلبا درست لائن پر ہیں وہ بھی میرا کوئی کمال نہیں، اللہ ہی کا فضل وکرم ہے۔ اگر مجھ میں کوئی ذاتی کمال وہنر ہوتا تو یہ 5 طلبا بھی ناکام نہ ہوتے۔ تعلیمی معاملے میں مجھے پریشان نہ کرتے۔ اس لیے استاد کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتا رہے۔ نیز "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" اور "وَبِکَ نَسْتَعِیْنُ یَافَتَّاحُ یَاعَلِیْمُ" پڑھتا رہے اور مدد مانگتا رہے۔

حافظ "رنگ والا" کا قصہ:

استاد اپنی درس گاہ کے امور میں مجتہد ہوتا ہے، چنانچہ یہ چیز استاد کی ذمہ داریوں میں داخل ہے کہ جس قسم کا لڑکا اس کے سامنے آیا ہے، اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس سلسلے میں یہ مشہور واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ اس قصے میں مدرسین کی اس الجھن کا کامیاب حل موجود ہے کہ کند ذہن بچوں کو کس طرح چلایا جائے۔ حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ نے فرمایا:

"میرے پاس ایک لڑکا ایسا داخل ہوا جو میرے بہت ہی محسن کا لڑکا تھا۔ دینی لحاظ سے بھی محسن اور دنیاوی لحاظ سے بھی۔ فرمایا: میں شروع میں یہاں کافی عرصہ کرائے کے مکان میں رہتا رہا۔ وہ شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا: میں آپ کو مکان بنوا دیتا ہوں۔ جب آپ کے پاس پیسے ہوں، تھوڑے تھوڑے کر کے ادا کرتے رہیے گا۔ پھر خود ہی انہوں نے پلاٹ خریدا اور خود ہی مجھے مکان بنوا کر دیا۔ جتنا حساب آیا، وہ مجھے بتا دیا۔ میں قسط وار تنخواہ میں سے کٹواتا

رہا۔کئی سال کے بعد میں اس سے فارغ ہوا۔اس طرح کے اور بہت سارے احسانات ان کے مجھ پر تھے۔پھر ان کا لڑکا پڑھنے کے لیے داخل ہو گیا.... یہ بھی اللہ کی شان ہے، عام طور پر مشاہدے میں یہ آیا ہے جن کے ساتھ اس قسم کے تعلقات ہوتے ہیں،ان میں سے اکثر کے بچے ذہنی طور پر چلنے میں کمزور ہوتے ہیں۔اس کے اندر کیا مسائل ہیں؟ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔انتظامیہ کی پوری توجہ اس کی طرف ہوتی ہے کہ یہ بچہ چلنا چاہیے اور استاد بھی پوری توجہ دے رہا ہوتا ہے،لیکن وہ چل کے نہیں دیتا.....وہ بھی ایک ایسا ہی بچہ تھا۔

اب اس کا حافظہ ایسا ہے کہ سارا دن محنت کر کے دو تین سطریں یاد ہوں اور اگلے دن صبح سنو تو کچا ہے۔فرماتے ہیں: میں نے اس کو اسی طرح پورا قرآن پاک ختم کروادیا،لیکن یاد کچھ نہیں ہے۔اگر ہم اس کو موقع دیتے کہ اچھا بھئی! بیٹھ کر پھیرا دے،مگر 2،3 گھنٹے ضائع کرنے کے بعد بھی کچھ یاد نہیں۔

پھر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے بارے میں یہ معمول بنالیا کہ نہ میں نے اس کو پھیرا دینے کا وقت دینا ہے، نہ یاد کرنے کا۔اس کا بس سننا ہے۔سبق آگے یاد کرانا ہے اور پیچھے سے سننا ہے۔اس میں غلطی کی کوئی تحدید نہیں ہے۔اس کی ہزار غلطی آجائے،2 ہزار یا 3 ہزار،اس پر کوئی باز پرس نہیں۔اس کے لیے میں ایسا کرتا کہ صبح اس کے سبق وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک لڑکے کو بلاتا۔صرف 2 رکوع اس کو سنواتا۔اس لیے کہ اگر میں کسی ایک ہی لڑکے کو سننے کے لیے لگا دیتا تو اس کا بھی سارے دن کا کام ضائع ہو جاتا،لہٰذا میں اس کا سننا کسی ایک طالب علم کے ذمے نہیں لگاتا تھا۔ایک طالب علم کو بلایا اور یہ بتادیا کہ اس کے پیچھے نہیں پڑنا۔ نہ ہی اس کو پیچھے سے پڑھانا ہے۔جہاں اس کی اٹکن آئے وہاں نشان لگادو۔تھوڑا سا بتادو اور آگے چلو۔چلتے جاؤ اور نشان لگاتے جاؤ۔فرمایا: شام تک اس کے 3 سپارے سنتے۔ان 3 پاروں میں ہزاروں غلطیاں آجاتیں۔اس کے قرآن پاک کا کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جس کے اوپر اس کی غلطی کا نشان نہ لگا ہو۔یہ ایک مثال بتا رہا ہوں،اس سے نیچے درجے کی کوئی مثال نہیں ہے۔

اسی طرح ہر روز 3 پارے سننے کی اس کی ترتیب چلتی رہی۔ سنتے سنتے ایک وقت ایسا آ گیا کہ اب اس کی غلطی کی تعداد میں فرق پیدا ہو گیا۔ اگر ایک پارے میں 100 غلطیاں آ رہی تھیں تو اب 80 غلطیاں آ رہی ہیں۔ پھر 70، پھر 60 تک پہنچا۔ ساتھ ساتھ اس بچے کو قرآن پاک پڑھنے کا بے حد شوق بھی پیدا ہو گیا۔''

حضرت نے اسے مناسب یاد کروا کر فارغ التحصیل کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اس کے ذہن میں بھی ڈال دی یا حضرت کی برکت سے خود ہی اس کے دل میں اتر گئی کہ ہر وقت میں نے منزل پڑھنی ہے۔ وہ قرآن پاک ساتھ رکھتا اور چلتے پھرتے منزل پڑھتا رہتا۔ جہاں غلطی آتی دیکھ لیتا۔ اس کا رنگ کا کاروبار تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے یہ بتایا اور سیکڑوں آدمیوں نے شہادت دی کہ اس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ رنگ نکال رہا ہے، رنگ تول رہا ہے یا اپنا کوئی بھی کام سرانجام دے رہا ہے..... زبان اس کی چل رہی ہے۔ بالآخر ملتان شہر میں اس کا نام ''پڑھنے والا حافظ'' مشہور ہو گیا۔ وہ ''پڑھنے والا حافظ رنگ والا'' کہلانے لگا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ رمضان شریف میں اپنا قرآن پاک رات کے آخری حصے میں سناتا تھا۔ اس کا پہلا وقت مساجد میں حفاظ کے پیچھے گزرتا۔ سنانے والے حافظ کے اوپر اس کا آ جانا ایک بہت بڑا خطرہ ہوتا تھا۔ اس کے آنے پر سب سہم جاتے کہ حافظ رنگ والا آ گیا! بھئی حافظ رنگ والا آ گیا!

ان حافظ صاحب کا اصل نام عبدالرزاق تھا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کا قرآن پاک بالکل یاد نہیں تھا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر کے بھی یاد کرنے میں ناکام رہتا۔ مگر حضرت رحمہ اللہ نے اس کو مذکورہ حکمت سے اس درجہ طاق کر دیا کہ ایک وقت وہ آ جاتا ہے کہ بڑے بڑے حفاظ اس کے پیچھے جانے سے کانپ جاتے ہیں۔

واضح رہے:

مدرسین اپنی درس گاہ کے بارے میں مجتہد ہوتے ہیں۔ ان کو اجتہاد کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس ایک ضابطہ بنا لیا، اب سب بچوں کو اس کے اوپر پیش کرنا ہے۔ جس کو

قانون موافق آ رہا ہے تو ٹھیک ہے اور جس کو نہیں آ رہا ہو تو کہتے ہیں، یہ حفظ نہیں کر سکتا۔ اگر اس نوعیت کا کوئی طالب علم آ گیا تو اسے اس طریقے پر چلا کر دیکھا جائے۔ یہ واقعہ بطور نمونہ ذکر کیا۔ عام طور پر اساتذہ اسے نمونے کے طور پر اپنے سامنے رکھنے کے بجائے یوں کہتے ہیں: دیکھو جی! انہوں نے (قاری محمد یاسین نے) بتایا تھا کہ ایسے لڑکے ہوتے ہیں۔ اب میرے پاس تو سب ہی ایسے ہیں۔ جس کو دیکھو وہ ایسا ہی ہے۔ یوں وہ اسے اپنی بدمحنتی کی دلیل بنا لیتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ درسگاہ میں شاذ و نادر ایسے لڑکے ہوتے ہیں، اس کو اپنا معیار نہ بنا لینا۔ میں نے تو ایک حکمت کی اور ایک مثال سامنے رکھی ہے کہ اگر کبھی ایسے لڑکے آ جائیں تو انہیں کیسے چلانا ہے۔

حکمت و تدبیر کا یہ درس ہمیں قرآن پاک نے دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس اصول کو اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں پیشِ نظر رکھیں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ." (النحل: 125) "اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو، اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔"

اسی طرح پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اُمِرْنَا اَنْ نُّکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ." (کنز العمال: 439/10)

"ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی سمجھ کے مطابق گفتگو کیا کریں۔"

یہ اصول شریعت کے مزاج کو واضح کرتا ہے۔ اس آیت و حدیث سے وہی اصول معلوم ہو رہا ہے جو اوپر طلبہ کے بارے میں اختیار کرنے کے حوالے سے آپ حضرات کے سامنے ذکر کیا۔ بہر کیف! زندگی کے ہر گوشے میں اسے اپنی عادت بنا لینے کی ضرورت ہے، تاہم درس گاہ میں بیٹھ کر اس کا بطورِ خاص خیال رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

سبقی پارہ

پانچ سبق:

وقت کے ساتھ ساتھ بچے کی مقدار خواندگی بڑھنے لگے گی۔ اس کے سپارے زیادہ ہو جائیں گے۔ آپ کو اب طالب علم کی منزل یاد رکھوانے کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس سلسلے میں ''سبقی پارہ'' سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، مگر اس سے بھی پہلے ''پانچ سبق'' کا نمبر ہے۔

مثال کے طور پر ایک بچے کا ڈیڑھ سپارہ ہو گیا ہے۔ اس نے سورۃ نوح مکمل کر لی ہے۔ اس نے اپنے تازہ سبق سے پچھلے 3، 5، 7 یا جتنے سبق بھی استاد مناسب سمجھے، وہ سبقی پارہ سے پہلے سنانا ہوں گے۔ استاد کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس مقدار کو علیحدہ سے یاد کروا کے سنے۔ اگر آپ کے پاس مناسب تعداد ہے تو پھر کسی سے سنوانے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود سنیں۔ اگر زیادہ تعداد ہے تو پھر سننے، سنانے کے لیے طلبہ کی معاونت حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔ تاہم یہ کام ان سے بڑی ذمہ داری اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ لینا ہوگا۔ ان 5 یا 7 اسباق کے بعد آدھا پارہ یا اس سے کچھ زیادہ سبقی پارہ کے طور پر سنا جائے۔ سبقی کو محفوظ رکھنے کے لیے طالب علم کو چاہیے کہ ہر سبق کے ساتھ پچھلے دو چار اسباق کو بھی پھیرا دے لیا کرے۔

بعض بچے خیانت کرتے ہیں:

یہ کیوں کہا گیا کہ استاد خود سنے اور بصورت دیگر کڑی نگرانی کرے؟ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو سبق بچے کو یاد نہیں ہوتا، وہ اسے چھوڑ دیتا ہے، مثلاً: اس کے آخری تین سبق سورۃ نوح کا آخری رکوع بنتا ہے۔ اب اس نے کسی بچے کو سنانا شروع کیا۔ سورۃ نوح کے آخری رکوع سے 5، 6 آیتیں چھوڑ دیں اور ساتھی بچے سے کہہ دیا:

''میرے تین سبق پورے ہو گئے ہیں۔''

اب جس بچے نے سنا ہے، اس نے استاد جی کو بتادیا:

''جی ہاں! اس نے تین سبق سنا دیے ہیں، ایک غلطی آگئی ہے۔'' (جیسا کہ معمول ہے، چلتا ہے کام)

استاد جی بھی زیادہ تفتیش کی زحمت نہیں کرتے، کہہ دیتے ہیں:

''اچھا بھئی! اب سبقی پارہ سناؤ پیچھے سے!''

اب اس کا سبقی پارہ کہاں تک بنتا ہے؟ ''تبارک الذی'' سے سورۃ نوح تک۔ مگر صحیح صورت حال سے استاد ہی آگاہ ہوگا۔ سننے والا تو اسی کو صحیح سمجھے گا جو اسے اس کا ساتھی بتائے گا۔ یہ بچہ 'سورہ معارج' تک سنا کے فارغ ہوگیا یا ''الحاقۃ'' تک سنالیا اور بتادیا کہ میرا سبقی پارہ مکمل ہوگیا ہے۔ سننے والا اسی پر یقین کرے گا اور استاد کو رپورٹ بھی دے دے گا۔ معلوم ہوا کہ اس بچے نے آج کی کارروائی میں دو ''دھوکے'' یے: ایک تو پانچ سبق سناتے وقت کیا کہ اپنا آخری سبق چھوڑ دیا۔ دوسرا، سبقی پارہ سناتے وقت پوری 'سورہ معارج' اور 'سورہ نوح' کا ایک رکوع چھوڑ دیا۔ استاد نے سننے والے بچے کی رپورٹ کو سو فیصد درست سمجھا اور بے فکر ہوگیا۔ سننے والا بھی مطمئن اور سنانے والا اپنی جگہ خوش کہ میری جان چھوٹ گئی!

آپ ہی بتائیے! بچے کا جو آخری سبق سننے سے رہ گیا ہے یا جو اس نے سبقی پارے میں ڈیڑھ سورت چھوڑ دی ہے، کیا وہ اسے کل یاد ہوں گے؟ نہیں ہوں گے۔ کل تک وہ مقامات بالکل کچے ہو چکے ہوں گے۔ اس کا یہ معمول مسلسل بھی جاری رہ سکتا ہے۔ بچوں کا جو سبقی پارہ یاد نہیں ہوتا، منزلیں کچی رہ جانے کی شکایت ہوتی ہے، اس کی اہم اور بنیادی وجہ استاد کی اسی قسم کی غفلت ہوتی ہے۔ اس لیے استاد نے اگر بچوں سے سننے، سنانے میں معاونت لینی ہے تو اس معاملے میں اسے ہوشیار ہونا پڑے گا۔

قرآن پاک تبدیل نہ کیا جائے:

ایک اہم بات اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ جو سپارے اور قرآن پاک ہم بچوں کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ قرآن پاک کے ختم ہونے تک یہ تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل تو اس

حوالے سے غفلت عام ہے۔ تاہم جس دور میں ہم نے قرآن پاک حفظ کیا، اس وقت کے اساتذہ میں اس چیز کا اتنی شدت سے معمول تھا کہ جس قرآن پاک پر اس نے شروع کیا ہے، ختم تک یہ قرآن پاک اس کے پاس ہر صورت میں رہنا چاہیے۔ اس میں تبدیلی نہیں آنی چاہیے۔ یہ گم نہیں ہونا چاہیے۔

لہٰذا اس چیز کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ مطالعہ پڑھانے، سبق دینے، سبقی پارہ اور منزل سنانے میں جتنی غلطیاں آئیں، سب نشانات اس قرآن پاک پر لگے ہوئے ہوں۔ اس چیز کا اس قدر مضبوطی سے اہتمام کرنے کی ضرورت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ اگر یہ قرآن پاک اس سے گم ہوگیا یا نئے قرآن پاک کے شوق میں بچے نے اس کو بدل لیا تو وہ سارے نشانات لگے لگائے ایک طرف ہو جائیں گے۔ بچہ ذہنی طور پر ان غلطیوں سے فارغ ہو جائے گا۔

دوسرا، ان نشانات کی مدد سے بچے کی طرف سے خیانت کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ معلوم ہو سکے گا کہ اس کے پانچ سبق اور سبقی پارہ کہاں تک بنتا ہے۔ لہٰذا سبق دیتے وقت استاد کو چاہیے کہ کسی اچھی باریک پنسل سے 5، 9، 11 یا جتنی سطریں اسے سبق دینا ہے، اس پر نشان لگا کر تاریخ ڈال دے۔ اس طرح جب قرآن پاک پر یومیہ کی بنیاد پر نشانات لگتے رہیں گے تو ان شاء اللہ بچوں کی بھی اتنی ''ٹریننگ'' ہو جائے گی اور انہیں پتہ چل سکے گا کہ ان کے ساتھی نے آج آخری سبق چھوڑ دیا ہے۔

استاد کو چاہیے کہ اس چیز کا مذاکرہ بھی بچوں کے اندر کرتا رہے۔ انہیں بتائے کہ جب آپ کے پاس کوئی پانچ سبق سنانے کے لیے آئے تو اس کا آپ جائزہ لیں کہ اس کا سبق کہاں تک ہے؟ اس نے آج کہاں تک سنایا؟

استاد خود بھی اس بارے میں ہوشیار رہے۔ جب کوئی بچہ سنا کر فارغ ہو تو سننے والے بچے کو اپنے پاس بلائے اور پوچھے:

''بھئی! اس نے کہاں سے شروع کیا تھا؟''

''سبقی پارہ، کہاں تک سنایا ہے؟''

"پانچ سبق کہاں تک سنائے ہیں؟"

بہر حال! ایک تو اس بات کا اہتمام کروانا چاہیے کہ بچے نے جس پارے پہ "عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ" شروع کیا ہے، ختم تک وہی سپارہ باقی رہے۔ پھر جس قرآن پاک پہ اس سے آگے پڑھنا شروع کرے تو اس بات کی کوشش کی جائے کہ آخر تک وہی قرآن پاک چلے۔

دوسرا، استاد اپنی پوری توجہ اور خصوصی کاوش بچوں پر صرف کرے۔ بچے غفلت اور منزل کچی ہونے کے ناقابلِ تلافی نقصان سے بچے رہیں گے۔

منزل سننا

اب سپاروں کا مرحلہ آگیا۔ بچوں کی منزلیں کیونکر قابو میں رہ سکتی ہیں؟ اس حوالے سے کچھ جاننے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ کے ہاں منزل کی پختگی کا معیار کیا تھا؟ حضرت کے شاگردوں میں سے کئی حضرات اس وقت موجود ہوں گے جنہوں نے حضرت کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ یہ سب اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ منزل کی پختگی کے حوالے سے حضرتؒ کا معیار کتنا کڑا تھا؟ حضرت فرمایا کرتے تھے:

''ہمارے نزدیک یاد ہونے کا معیار یہ ہے کہ غلطی اور اٹکن کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔''

بہر حال! بچوں کی منزلیں مختلف ہوں گی۔ اسی طرح سنانے کی ترتیب بھی جدا جدا ہوگی۔ کسی بچے نے ڈیڑھ پارہ سنانا ہوگا تو کسی نے دو۔ بعض نے صرف ایک پارہ سنانا ہوگا۔ اس معاملے میں ہر استاد کی اپنی صوابدید کا دخل ہوتا ہے، تاہم اپنے بچوں کی منزل کا معیار بہتر کرنے کے لیے یہ دو باتیں بطورِ خاص قابلِ توجہ ہیں:

پہلی بات:

اس سلسلے میں پیشِ نظر رکھنے کی ایک بات تو وہی ہے جس کا کچھ ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا۔ وہ یہ کہ بچے اس میں بھی عموماً ''خیانت'' کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر طالب علم پارہ سناتے سناتے ''فَمَنْ اَظْلَمُ'' تک آگیا ہے۔ کل اس نے ''وَمَالِیَ'' سنایا تھا۔ اس سے قبل ''وَمَنْ یَّقْنُتْ'' بھی سنا چکا ہے۔ آج اس نے 24واں پارہ سنانا ہے، مگر اسے یاد نہیں۔ اب وہ کیا کرے گا۔ وہ اسے چھوڑ کر ''اِلَیْهِ یُرَدُّ'' سنا دے گا۔

اب سننے والوں کو کیا معلوم کہ اس نے کل کون سا پارہ سنایا تھا۔ یہ تو بڑی صفائی سے اپنے ساتھی سے کہہ دے گا:

''بھئی! میرا آج کا پارہ ہے: "اِلَیْہِ یُرَدُّ"، آپ سن لیجیے!''

سننے کے بعد غلطیاں بتائے جانے سے استاد بھی مطمئن ہو جائے گا۔ یہ ہر بار اسے چھوڑتا رہے گا۔ ہمت بڑھے گی تو اور پاروں کے بارے میں بھی یہ تجربہ دہرائے گا۔ نتیجتاً منزل کی بہت بڑی مقدار سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ استاد اپنی جگہ پریشان رہے گا کہ بچوں کی منزلیں کیوں یاد نہیں ہوتیں!

آج کے اساتذہ میں غفلت کا یہ عالم ہے کہ اگر درسگاہ بیس لڑکوں پر مشتمل ہے تو انہیں ان کے نام بھی زبانی یاد نہیں ہوتے۔ اس سے پہلے کے اساتذہ کرام ہم نے دیکھے کہ اگر کسی کی درسگاہ کے پینتالیس بچے ہیں تو ان کو اپنے بچوں کے نام، ان کی ولدیت، اگر مقامی ہے تو محلے اور شہر کا نام، اگر رہائشی (مقیم) ہے تو اس کا شہر وغیرہ.... تمام چیزیں ازبر یاد ہوتی تھیں۔

ہم نے اپنے اساتذہ کے ہاں مشاہدہ کیا کہ کسی ایک طالب علم کو بلا لیتے اور فرماتے:

''اچھا بھئی! فلاں کو سپارہ سنا کے آ!''

اور دوسرے طالب علم کو بلا کر بتلاتے:

''بھئی! اس نے کل فلاں جگہ سے سپارہ سنایا تھا، اتنی غلطیاں آئی تھیں، آج فلاں جگہ سے اس کا پارہ ہے.... دھیان سے سن لینا۔''

اب جو استاذ اپنے طلبہ کے بارے میں اس قدر حساس ہے۔ ان کے حوالے سے ایک ایک بات اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ تصور کیجیے! اس کی کلاس میں کس قدر باغ و بہار ہوگی۔ ان کی منزلوں کی پختگی کا کیا عالم ہوگا.... اور یہی ہے راز پہلے زمانے کے اساتذہ کی کامیابی کا!

آج بھی اساتذہ کو سب سے زیادہ ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر معاملے میں جو سطحیت کا پہلو غالب آتا جا رہا ہے، یہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔

دوسری بات:

عام طور پر امتحانات میں دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ بچوں کو سورتوں کے نام اور ان کے رکوع یاد نہیں ہوتے۔ یہاں تک بھی دیکھنے کو ملتا ہے، مثال کے طور پر بچے سے پڑھایا:

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ."

سورۃ روم میں سے، 21ویں پارے سے پڑھایا۔اب اتفاق کی بات کہ تین چار آیتیں پڑھنے کے بعد اس کی غلطی آ گئی۔ ممتحن اس سے کہتا ہے:

"قرآن کھول کر غلطی پر نشان لگاؤ، دیکھو کیا ہے؟"

ہم نے دیکھا کہ وہ دس، دس منٹ لگا دیتا ہے۔ ورق پہ ورق الٹ رہا ہے۔اسے یہ پتہ نہیں، میں کہاں سے پڑھ رہا ہوں۔لہٰذا اس کی مشق کی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ درسگاہ میں بچوں سے "ٹو کھوپیں" سوال کیے جائیں۔کوئی بھی آیت پڑھ دی، پھر بچے سے پوچھ لیا:

"اچھا بھئی! یہ آیت کون سے سپارے کی ہے؟ کون سی سورت ہے؟"

اور یہ کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔اگر درسگاہ میں پانچ منٹ بھی، دس منٹ بھی، آپ اس کام کے لیے وقف کر دیں گے، دو چار بچوں سے بھی اس قسم کا سوال کر لیا کریں گے تو بچوں میں یہ استعداد پیدا ہو جائے گی کہ یہ آیت کون سے پارے میں ہے؟ کون سی سورت میں ہے؟ لہٰذا سورتوں کے نام اور سورتوں کے رکوع وغیرہ بھی بچوں کو یاد کروانے چاہییں۔

ہر بچہ اتنا ضرور جانتا ہو کہ فلاں سورۃ مکی ہے، فلاں مدنی۔اور یہ کہ اس سورت کے کل اتنے رکوع ہیں۔ پہلا رکوع اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔دوسرا اور تیسرا فلاں، فلاں آیت سے، وغیرہ۔لہٰذا اگر بچے سے یہ کہا جائے کہ سورۃ طٰـــہٰ کا پانچواں رکوع سناؤ تو وہ فوراً پڑھ سکے۔نیز استاد محترم یاد کروانے کے ساتھ ساتھ خود بھی یاد کرتے رہا کریں۔اسی طرح کبھی کبھار طلبہ کا باہم مقابلہ بھی کروایا جائے۔اس کے بے شمار تعلیمی اور نفسیاتی فوائد ہیں۔

☆☆☆

ختمِ قرآن

طالب علم خراماں خراماں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کامیابی کے قریب آن پہنچتا ہے۔اس کے چند پارے باقی رہ جاتے ہیں۔اگر 2یا3 سال اطمینان اور صبر سے گزار لیے تھے تو یہاں آکر یہ پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔اگر پیچھے 24، 25 سپارے ترتیب سے پڑھا دیے ہیں تو آخر میں آکر یہ حال کیا جاتا ہے کہ بچے کا سبق تو زیادہ سے زیادہ ہوتا رہے، پیچھے سے سپارے ہوں یا نہ ہوں، تاکہ قرآن پاک جلدی ختم ہو جائے۔ایسا عموماً تب ہوتا ہے جب بچے کے پانچ، چھ سپارے رہ جاتے ہیں۔کچھ والدین کی طرف سے تقاضا بڑھ جاتا ہے۔کچھ بچے کا بھی شوق غالب ہوتا ہے۔کچھ استاد کا ''اندر'' کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔

جب یہ ترتیب پیدا ہوتی ہے تو اگر وہ پانچ سپارے ختم کروانے میں بہت جلدی بھی کرے تو دو مہینے لگائے گا۔ان دو مہینوں تک پچھلا سننا، سنانا موقوف رکھا تو سمجھو کہ اگر کوئی بچہ تین سال میں یہاں تک پہنچا تھا تو اب ان دو ماہ میں اس نے اپنی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔اسی طرح فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد بڑھانے کے لیے بعض اوقات اس قسم کی جلد بازی اختیار کی جاتی ہے، یہ ہرگز مناسب نہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ کبھی ختم قرآن کے بالکل قریب شیطان بچے پر اچانک حملہ آور ہو کر اسے بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔اس لیے نہایت حکمت عملی سے اس کا قرآن پاک پورا کروائیں۔

الحاصل! اخیر سپارے تک اپنے سننے، سنانے کے نظام کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔

☆☆☆

تدریسِ حفظ کے اصول: ایک خلاصہ

طالب علم کے ابتدائی دن:

☆...... نئے آنے والے طلبا کی حوصلہ افزائی کریں، ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں، اپنی بول چال کا انداز اور لب و لہجہ اچھا رکھیں۔ نئے آنے والے طلبا کی درس گاہ میں بیٹھنے کی جگہ اپنے قریب بنائیں، تاکہ وہ توجہ اور دھیان سے پڑھیں۔ اگر دور بٹھائیں گے تو وہ اِدھر اُدھر دیکھیں گے۔ دوسرے طلبا کی توجہ ہٹانے کا سبب بنیں گے۔ اس صورت میں استاد کو ان پر غصہ آئے گا اور شروع ہی میں ڈانٹ ڈپٹ کی نوبت آجائے گی۔

☆...... ابتدائی طور پر نئے طالب علم کو دو، تین حروف سبق پڑھائیں، جب اس کو یہ دو، تین حروف یاد ہو جائیں تو کچھ دیر کے بعد دو تین حروف اور پڑھا دیں۔ اس دوران ان حروف کے مخارج اچھی طرح درست کروا دیں۔ مزید کسی پرانے لڑکے کے ذمے لگائیں کہ وہ نئے طالب علم کی مشق کرادے۔

قاعدے کی محنت:

☆...... حرکات کی اچھی طرح پہچان کروائیں۔

☆...... حروف کو حرکات کے ساتھ صحیح پڑھانے کا اہتمام کریں۔ یعنی حرکات والی تختی توجہ اور دھیان سے پڑھائیں۔ بعض طلبا حرف کا مخرج تو صحیح ادا کرتے ہیں لیکن جب اس پر حرکت پڑھتے ہیں تو اس وقت ان سے غلطی ہو جاتی ہے، مثلاً: بعض طلبا پڑھتے ہیں ع زیر اِ، ط پیش ٹ۔ اب یہ حروف ابتداءً صحیح پڑھے گئے ہیں، مگر حرکت کے بعد ان کو غلط پڑھا گیا ہے۔

☆...... نورانی قاعدے کی ا مـــ، او ی والی تختی پر پہنچ کر کوشش کریں کہ ہجے طالب علم خود کرے۔

ناظرہ کا آغاز اور ہجے کی اہمیت:

☆......قاعدہ ختم ہونے کے بعد جب ناظرہ شروع کرائیں تو ہر آیت کو ہجے کے ساتھ پڑھائیں۔ ابتدائی طور پر ناظرہ کا صرف آج کا سبق نہ سنا جائے بلکہ جتنا پڑھا ہے شروع سے سارا سنا جائے، مثلاً: ایک طالب علم نے اگر ایک پاؤ ناظرہ پڑھا ہے، اس سے سبق سننے کے بعد پورا پاؤ بھی سن لیا جائے۔ اس سے ان شاء اللہ اس کا ناظرہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اور ہر نیا سبق ہجے کے ساتھ ہی پڑھایا جائے۔

☆......حفظ شروع کرنے والے طلبا کا معاملہ بھی اسی طرح ہے، ان کو کم سے کم ایک پارہ ہجے کے ساتھ پڑھایا جائے۔ جس میں غنہ، مد، تشدید اور وقف وغیرہ کی اچھی طرح پہچان اور مشق کروائی جائے۔

☆......غنہ اور پُر، باریک سمجھانے کے لیے طالب علم کو پنسل کے رنگ کے ساتھ نشانی بتا دی جائے کہ اس رنگ والے نشان کا مطلب ہے کہ یہاں غنہ ہوگا اور اس رنگ کا مقصد ہے کہ یہ حرف پُر پڑھا جائے گا۔ اس طرح اس کے سبق پر یہ نشانات لگا دیے جائیں، مثلاً: نیلا رنگ غنہ کے لیے اور سرخ رنگ حرف کو پُر پڑھنے کے لیے۔ کچھ وقت کے بعد پُر، باریک کے یہ نشانات لگانا خود طالب علم کے ذمے لگا دیا جائے کہ وہ اپنے "مطالعے" پر خود نشانات لگا کر آئے۔

تحفیظ اور تجوید، ایک ساتھ:

☆......تجوید کے ضروری قواعد بھی ابتدائی بچوں کو ساتھ ساتھ بتاتے اور سمجھاتے رہیں، مثلاً: طالب علم کو ضابطہ یوں بتایا جائے کہ "یہ نون مشدد ہے"، "اس پر یہ تشدید ہے" اور "ہر نون مشدد پر غنہ ہوتا ہے۔" اگر چند سورتوں پر اسی طریقے سے محنت اور مشق کرائی گئی تو یہ طالب علم بہت اچھا پڑھے گا اور ان شاء اللہ بہت جلد مکمل بھی کرلے گا۔

☆......تجوید کی غلطیوں کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ابتدائی طور پر تجوید پر محنت نہیں کروائی جاتی۔ جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ حفظ مکمل کرنے کے بعد بھی حافظ قرآن کی تجوید

درست نہیں ہوتی۔ اگر استاد شروع میں تھوڑی سی توجہ کر لے تو ہمیشہ آسانی رہے گی۔

☆......سمجھ دار بچوں کو عموماً اور گردان والوں کو خصوصاً مدّ، غنّہ، پُر، باریک وغیرہ تجوید کے اہم اہم اصول سمجھا دینے چاہییں، بلکہ گردان والوں کو جمال القرآن یا خلاصۃ التجوید پڑھا دینی چاہیے۔

طالب علم کی شخصیت کی تعمیر:

☆......استاد کو چاہیے کہ طالب علم پر شروع ہی سے نگاہ رکھے۔ اور اس کو درس گاہ میں بیٹھنے، پڑھنے، بولنے اور قرآن پاک کو رکھنے، اٹھانے وغیرہ کا سلیقہ سکھائے۔

مطالعہ کہلوانے کے تین مراحل:

☆......ابتدائی طالب علم کو نئے سبق کا مطالعہ کہلوانا بہت ضروری ہے۔ یعنی جو سبق طالب علم نے آج پڑھنا ہے، اس پر صرف نشان لگا کر طالب علم کو واپس نہ بھیج دیا جائے بلکہ مطالعہ کہلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علم کے ذمے مثلاً تین سطریں لگا دی جائیں کہ وہ استاد کے نزدیک بیٹھ کر مطالعہ تیار کرے۔ اپنی زبان سے پڑھے۔ تجوید کا لحاظ کرے۔ اور غنہ وغیرہ کے نشان لگائے۔ پُر اور باریک کی پہچان کرے۔ اس کے بعد دوسرا کام یہ کیا جائے کہ اس سے زیادہ منزل والا لڑکا اس طالب علم کا مطالعہ سن لے۔ اور جو یہ غلطیاں کرے وہ درست کروا دے۔ تیسرا کام یہ ہے کہ اب استاد خود طالب علم سے یہ مطالعہ سنے۔ کوئی بھی غلطی ہو تو وہ درست کروا دے۔ ان شاء اللہ جو سبق ان تین چھلنیوں سے چھن کر یاد کیا جائے گا اس میں کوئی پکی یا تجوید وغیرہ کی غلطی نہیں رہے گی۔ اگر کسی طالب علم کے "مطالعہ" میں غلطی رہ جاتی ہے تو وہ "سبق" کو غلط ہی یاد کر لیتا ہے اور پھر ساری زندگی اس کی وہ غلطی باقی رہتی ہے۔ اگر کسی طالب علم سے کوئی پکی غلطی سنی جائے اس کو فوراً نہ بتایا جائے، بلکہ پہلے اسے غلطی کا احساس دلائیں، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میری غلطی کیا تھی، اس کے بعد اس کو صحیح بتایا جائے۔

مقدار خواندگی میں اضافہ یوں کریں:

☆......رفتہ رفتہ مقدار خواندگی میں اضافہ کیا جائے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تقریباً

دو پارے مکمل ہونے کے بعد جتنا سبق طالب علم روزانہ یاد کر رہا ہو، اس میں ایک یا آدھی سطر کا اضافہ کر دیں، پھر دس پندرہ دن تک یہی مقدار رہے۔ اس کے بعد ایک یا دو سطر کا اضافہ کریں۔ پھر کچھ دن اسی مقدار سے سبق چلائیں۔ ہفتہ دس دن کے بعد ایک، دو یا تین سطر بڑھا دیں۔ اس طریقے سے ان شاء اللہ طالب علم کا سبق دوگنا یا اس سے بھی زیادہ چل پڑے گا۔

حفظ کے استاد کے دو اہم فرائض:

☆...... جس طرح نماز کے اندر بعض چیزیں فرض کے درجے میں ہیں یعنی ان کے بغیر نماز ادا ہی نہیں ہوتی، اسی طرح دو چیزیں حفظ پڑھانے میں فرض کے درجے میں ہیں:

1...... ہر طالب علم کو مطالعہ خود پڑھانا۔

2...... ہر طالب علم کا سبق خود سننا۔

ان دو فرائض میں معمولی کوتاہی بھی بڑے نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔

☆...... سبق کے بعد ہر طالب علم سے اس سے پچھلے پانچ سبق سنے جائیں۔ اس کے بعد سبقی پارہ ہو، پھر منزل۔ تقریباً ایک پارہ سبقی اور دو پارے منزل ہونے چاہییں۔ منزل اور سبقی پارہ سننے میں طلبہ سے تعاون لیا جا سکتا ہے۔ سبق کے بعد پانچ سبق بھی اگر استاد خود سن لے تو بہت اچھا ہے۔

سبقی پارہ اور منزل سننے سنانے میں طلبا کی ہوشیاریاں:

☆...... جب طالب علم اپنے پانچ سبق دوسرے طالب علم کو سناتا ہے تو بسا اوقات وہ یہ ہوشیاری کرتا ہے کہ آخری دو سبق چھوڑ کر اس سے پچھلے پانچ سبق سنا دیتا ہے اور سننے والا اسی کی غلطی وغیرہ بتا دیتا ہے۔ اسی طرح سبقی پارہ سنانے میں بعض طلبا یہ ہوشیاری کرتے ہیں کہ آخری پاؤ چھوڑ دیتے اور کہہ دیتے ہیں کہ میرا سبق یہیں تک ہے۔ اب اس صورت میں پارہ ختم تو ہو جاتا ہے، لیکن ختم کرنے کے بعد اس پارے کو یاد کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ نیز اسی طرح منزل والے پاروں میں بعض طلبا یہ ہوشیاری کرتے ہیں کہ جو پارے ان کو یاد ہوتے اور آسان ہوتے ہیں، وہی سناتے رہتے ہیں۔ جو پارے کچے ہوتے ہیں، انہیں چھوڑ دیتے

ہیں، مثلاً: ایک طالب علم کی منزل کا پارہ نمبر 25 ہے۔ مگر اس کو یاد نہیں ہے اور پارہ نمبر 26 یاد ہے۔ تو آج وہ پارہ نمبر 26 ہی سنا دے گا۔ اور پھر کل جب پارہ نمبر 26 سنانے کی باری ہوگی تو یہی پارہ سنائے گا۔ اس طرح اس کا پارہ نمبر 25 مسلسل بھولتا جائے گا۔

طلبا کو اس ہوشیاری سے روکنے کے لیے استاد یہ کام کرے کہ ہر روز اچانک دو طلبہ کو بلا کر ان کے پانچ سبق یا سبقی وغیرہ خود سن لے اور اسی طرح سننے سنانے والی جوڑی کو اپنے پاس بلا کر سن لے اور دیکھ لے کہ آیا واقعتاً صحیح سنایا جا رہا ہے یا نہیں۔ اور اسی طرح منزل کا جائزہ بھی لیتا رہے کہ جو پارہ آج سنانا تھا، کیا واقعتاً وہی سنایا گیا ہے یا نہیں۔

☆...... طلبا کی تعلیم و تربیت پر یہ ابتدائی محنت بہت سارے فوائد کی حامل ہے۔ یہ طلبا ہمارے پاس والدین، قوم، ادارے اور اللہ کی طرف سے امانت ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ہمارا فرض ہے۔ ان کو صحیح نہ پڑھانا خیانت اور بدعہدی ہے۔

☆☆☆

نقشۂ معیارِ مقدارِ خواندگی، شعبہ حفظ

وضاحت: اس نقشے کی مدد سے بچے اور استاد کی کارکردگی جانچنے میں آسانی ہوگی۔

درجہ	نورانی قاعدہ	پارہ عمّ نماز مکمل	فی پارہ ۲۶ تا ۲۹ پ	فی پارہ ۲۱ تا ۲۵ پ	فی پارہ ۱۱ تا ۲۰ پ	فی پارہ ۱ تا ۱۰ پ
اول	ایک ماہ	۵۰ یوم	۳۰ یوم	۱۸ یوم	۱۵ یوم	۱۰ یوم
دوم	ڈیڑھ ماہ	دو ماہ	۴۰ یوم	۲۷ یوم	۲۰ یوم	۱۴ یوم
سوم	دو ماہ	اڑھائی ماہ	۴۲ یوم	۳۴ یوم	۲۵ یوم	۱۸ یوم
مناسب	چار ماہ	تین ماہ	۴۵ یوم	۳۸ یوم	۲۸ یوم	۲۵ یوم
ادنی	پانچ ماہ	ساڑھے تین ماہ	۵۲ یوم	۴۲ یوم	۳۲ یوم	۳۰ یوم

نقشہ بالا کے مطابق مکمل قرآن کریم

اول	دوم	سوم	مناسب	ادنی
ایک سال چھ ماہ	دو سال	دو سال چھ ماہ	تین سال ایک ماہ	تین سال سات ماہ

شعبہ گردان

حفظ قرآن کریم کے شعبے میں "گردان" کی اہمیت حفظ سے بھی زیادہ ہے۔اس لیے کہ حفظ کی کمی بیشی گردان میں پوری ہوسکتی ہے لیکن اگر گردان میں کمی کوتاہی رہ جائے تو اس کا ازالہ اکثر اوقات ساری زندگی میں نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے شعبہ گردان کے مدرس کو اپنی ذمہ داری کا بھرپور احساس ہونا چاہیے۔میرے پاس الحمدللہ اب تک ہزاروں بچے گردان کرچکے ہیں۔میں نے سالہا سال کی تدریس کے دوران گردان کو بہتر انداز سے کرانے کے لیے جو طریقِ کار سمجھا ہے اوراس کے مطابق اپنے طلبہ کو گردان کروائی ہے،وہ چند نکات کی روشنی میں پیشِ خدمت ہے:

امتحانِ داخلہ:

گردان کے مدرس کے پاس اکثر دوسرے مدرسے یا دوسری درس گاہ سے طلبہ آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان کو داخلہ دینے سے پہلے امتحان لیا جاتا ہے۔جس میں ہر پانچ پاروں میں سے ایک ایک رکوع سنا جاتا ہے۔اس کی پوری تفصیل "تعلیمی رپورٹ" (کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) میں درج کردی جاتی ہے کہ کون کون سے رکوع سنے اور کس رکوع میں کتنی غلطیاں آئیں۔ان سنے گئے 6 رکوع کی غلطیوں کے مجموعے سے طالب علم کو آگاہ کیا جاتا ہے۔تجوید کی کیفیت کا بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ مزید اس پر کتنی محنت درکار ہے۔اس سے ایک تو بچے کو اس بات کا احساس رہتا ہے کہ جب میں داخلہ لینے آیا تھا تو میری منزل کی کیفیت یہ تھی۔دوسرے،مدرس کو بھی یہ فیصلہ کرنے میں آسانی رہتی ہے کہ یہ بچہ ایک سال میں صحیح طور پر گردان مکمل کرلے گا یا اس کے لیے دو سال کی محنت درکار ہوگی۔اسی طرح یہ سمجھنے میں بھی آسانی رہتی ہے کہ اس پر کس نوعیت کی اور کتنی محنت کی ضرورت ہے؟

میرے حضرت قاری صاحبؒ کا معمول ایسے طلبا کے لیے عموماً یہ تھا کہ نئے طلبا کو پہلے سے زیرِ تعلیم طلبا کے پارے سنواتے تھے۔ کسی کے 2، کسی کے 3، کسی کے 5۔ نیز تاکید فرماتے کہ توجہ اور دھیان سے سننا! کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ پارے سننے کے بعد نیا طالب علم حضرت کو آگاہ کرتا کہ اس نے بالکل صحیح سنایا۔ کوئی کہتا کہ اس کی پانچ پاروں میں ایک غلطی آئی ہے، مثلاً۔ تو حضرت فرماتے:

''اچھی طرح بھی سنا ہے؟''

وہ کہتا: ''ٹھیک سنا ہے۔''

پھر سننے والے سے فرماتے: ''تیرا بھی ایسے یاد ہے؟''

جواب نفی میں ہوتا۔ پھر فرماتے: ''شروع میں سنانے والے بھی ایسے ہی تھے۔''

اس طریق کار سے نیا آنے والا خود بخود محنت سے پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔

نورانی قاعدہ:

بچے کو داخل کر لینے کے بعد اس کو نورانی قاعدہ پھر سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے ایک تو حروف کی ادائیگی مزید درست ہو جاتی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم کو قاعدہ پڑھانے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔ مگر عموماً دیکھا جاتا ہے کہ ایسے طلبا کو قاعدہ صحیح طریقہ سے نہیں پڑھایا گیا ہوتا۔ ہجا وغیرہ میں کمزور ہوتے ہیں۔ اس درجے کے طلبہ کو قاعدہ پڑھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ استاد پوری کلاس کو ایک تختی پڑھا دے اور پھر چار چار، پانچ پانچ طلبہ کی جماعتیں بنا دی جائیں۔ ہر جماعت میں سے اچھا پڑھنے والا طالب علم دوسروں کو بھرپور مشق کرا دے۔ اس طرح دو سے تین ہفتے کے درمیان نورانی قاعدہ مشق کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔

نورانی قاعدہ ختم ہونے کے بعد نماز حنفی بھی دوبارہ پڑھا دی جائے۔ نماز حنفی پڑھانے کے دوران ان کو عملی طور پر نماز پڑھنے اور پڑھانے کی مشق بھی کرائی جائے۔ غسل، طہارت اور صفائی کے مسائل بھی سمجھائے جائیں۔ اسی طرح نماز جنازہ اور عیدین وغیرہ کا طریقہ بھی سمجھایا جائے۔ خاص طور پر خطبات یاد کروا دیے جائیں۔ یہ تمام عمل نورانی قاعدہ کے ختم ہونے کے

بعد اور گردان شروع کرنے کے ساتھ ساتھ جاری رکھا جائے۔ سورۃ الفاتحہ سے تھوڑا تھوڑا سبق دے کر گردان کا آغاز کیا جائے۔ ابتدا میں سبق تھوڑا ہو چھ سطریں، آدھا صفحہ یا ایک رکوع۔ لیکن اس دوران تجوید اور لہجہ درست کرنے کی خوب مشق کروائی جائے۔ غنہ، مد، پُر، باریک، وقف اور دیگر قواعدِ تجوید کا خوب اہتمام کے ساتھ اجرا کروایا جائے۔

یومیہ منزل:

ابتدائی دنوں میں جب نورانی قاعدہ، نماز حنفی اور پہلے پارے کی مشق چل رہی ہو تو اس دوران ہر طالب علم روزانہ کم از کم پانچ پارے منزل پڑھتا رہے۔ زبانی پڑھ سکے تو بہتر ہے ورنہ دیکھ کر ہی پڑھتا رہے۔ یہ روزانہ پانچ پارے ناظرہ پڑھنا، ترتیب وار اور آسانی کے ساتھ منزل یاد کرنے میں بہت معاون ثابت ہوگا۔ عام طور پر گردان کے اساتذہ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے طلبہ کی پہلے سے کمزور منزل اور زیادہ خطرناک حد تک کمزور ہو جاتی ہے۔

ایک اہم غلطی:

اکثر گردان کے اساتذہ گردان کا سبق باقاعدہ مطالعہ سنے بغیر طالب علم کو آگے یاد کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں یا صرف نشان لگا دیا کہ آج اتنا سبق یاد کرلو۔ ضروری ہے کہ طالب علم کو آگے سبق دینے کے لیے باقاعدہ مطالعہ سنا جائے۔ پختہ اغلاطِ تجوید خصوصاً اخفاء، اظہار، پُر، باریک اور غنہ، مد کا خیال کر کے مطالعہ سنا جائے۔ نیز نشان لگائے جائیں۔ ان کا سبق چونکہ زیادہ ہوتا ہے، اس لیے ان کا مطالعہ سننے کے لیے معتد بہ تعداد میں مطالعہ سننے والی، مستعد طلبہ کی جماعت بنائی جائے۔ جو اس قسم کی غلطیاں نکالنے کا طریقہ جانتے ہوں۔

پہلی گردان:

طالب علم کو صحیح منزل یاد کرانے کے لیے کم از کم تین مرتبہ قرآن پاک ختم کرانا ضروری ہے۔ ان تین میں سے پہلی گردان قرآن پاک کے شروع سے یعنی سورۃ الفاتحہ سے شروع ہوگی۔ جس میں ابتداءً ایک پارہ یا دو پارے تھوڑا تھوڑا سبق کر کے پڑھائے جائیں گے۔ یہ

سبق چھ لائن یا اس سے زیادہ ایک رکوع پر مشتمل ہو یا بعض ذہین بچوں کے لیے اس سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔ البتہ ایک پارہ مشق کے ساتھ مکمل ہونے کے بعد اکثر بچے زیادہ سبق لینے لگتے ہیں۔

سبق، سبقی اور منزل کی مقدار:

پہلی گردان کے دوران سبق مناسب مقدار کا ہو، جو زیادہ سے زیادہ ایک پاؤ ہوسکتا ہے اور سبقی کم از کم ایک پارہ اور منزل (یومیہ سنائے جانے والے) دو پارے ہو۔ مذکورہ سبقی پارہ، سبق اور منزل کے علاوہ تین پارے یومیہ کے حساب سے قرآن کریم کی تلاوت جاری رہے جو قاعدہ اور نماز حنفی کے دوران 5 پارے تھی، اب پہلی گردان کے دوران 15 پارے مکمل ہونے تک 3 پارے رہے گی۔

وقت کی تقسیم:

صبح فجر سے دوپہر (12 بجے) تک سبقی، سبق، منزل سنانا اور مطالعہ پڑھانا... یہ تمام کام مکمل کر لیے جائیں۔ ظہر کے بعد بچے کل کے لیے منزل یاد کریں۔ آج والی منزل کا جائزہ دیں اور پھر سبق یاد کریں۔ بعض یا تمام بچے رات تک سبق سنا لیں تو بہت ہی اچھا ہے۔

دوسری گردان:

پہلی گردان مکمل ہونے کے بعد دوسری گردان شروع کرائی جائے اور یہ گردان سورۃ الناس سے شروع ہو کر سورۃ الفاتحہ پر ختم ہوگی۔ اس گردان میں سبق آدھا پارہ چلتا رہے گا۔ جبکہ سبقی اور منزل کی ترتیب وہی رہے گی۔ یعنی سبقی ایک پارہ اور منزل دو پارے۔ اس دوسری گردان سے منزل سنانے کے لیے 3 پارے ہوں گے۔

تیسری گردان:

دوسری گردان کے بعد تیسری شروع کروائی جائے اور یہ گردان سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس تک ہوگی اور اس میں سبق ہر روز ایک پارہ ہوگا۔

بھلکڑ طلبہ کا علاج:

بعض طلبہ ایسے بھی آجاتے ہیں کہ وہ قرآن پاک یاد کرتے ہیں، لیکن بے چارے جلد

بھول بھی جاتے ہیں۔ ایسا کبھی یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ سب طلبہ کو گناہوں سے بچنے کی خصوصی تلقین کرتے رہیں کہ حافظے کی کمزوری کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔
ایسے طلبہ گردان میں کبھی دو یا تین سال بھی لگا دیتے ہیں۔ ان کی منزل پھر بھی یاد نہیں ہوتی۔ اس کا حل پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ایسے طلبہ کا سبق اور سبقی وغیرہ جاری رکھنی چاہیے۔ ان کی زیادہ غلطیوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی استطاعت کے مطابق منزل یاد کروا کر فارغ کر دینا چاہیے۔ فارغ ہونے کے بعد پابندی اور اہتمام کے ساتھ تلاوت کرتے رہے تو ان شاء اللہ آگے چل کر ان کو قرآن پاک از بر یاد ہو جائے گا۔

گردان اور دَور کی ایک شرعی بنیاد:

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ حضرات اساتذہ فن نے جو ترتیبیں بھی حفظ قرآن کے عمل کو بہتر اور آسان بنانے کے لیے قائم فرمائی ہیں۔ ان کی بنیاد یں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ تحفیظ قرآن کے اس طریق کار کے اختتام پر مثال کے طور گردان اور دور سے متعلق ایک حوالہ عرض کرتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

" كَانَ جِبْرَئِيلُ يَعْرِضُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ القرآنَ كُلَّ عامٍ مرَّةً فَعَرَضَ عَلَيْهِ مرّتَينِ فِي العَامِ الَّذِي قُبِضَ. " (صحیح البخاری :748/2)

''حضرت جبریل امین علیہ السلام سال میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک کا دور فرمایا کرتے تھے۔ جس سال آپ علیہ السلام کا وصال ہوا اس سال حضرت جبریلؑ نے دو مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دور فرمایا۔'' اس سے واضح ہے کلام الٰہی کو یاد رکھنے کا رائج طریقہ خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے من وعن ثابت ہے۔

☆☆☆

امتحانِ وفاق کی تیاری

داخلۂ وفاق:

وفاق المدارس کے داخلے سال کے درمیان ہی جانے لگتے ہیں۔ جب کہ بعض طلبہ کی ابھی تک پہلی گردان بھی مکمل نہیں ہوئی ہوتی، اب کس کا داخلہ بھیجیں اور کس کا نہ بھیجیں؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ دیکھ لیا جائے کہ ربیع الثانی کے آخر تک جس طالب علم کے کم از کم 25 پارے مکمل ہو رہے ہوں اور منزل یاد ہو تو اس کا داخلہ بھیج دیا جائے، لیکن اگر اس سے کم مقدار خواندگی ہے اور پھر طالب علم ذہین بھی نہیں ہے تو اس کا ایک سال اور لگوایا جائے۔

منزل کی پختگی اور امتحان کی تیاری:

ربیع الثانی کے مہینے سے منزل پختہ کرانے کے لیے اور امتحان کی تیاری کے لیے تین کام انتہائی اہم اور آزمودہ ہیں:

۱) جب کم از کم ایک مرتبہ گردان ہو جائے تو اب یومیہ صبح کے وقت ساڑھے سات پارے تلاوت کرائی جائے اور ظہر کے بعد ان ساڑھے سات پاروں کا جائزہ لیا جائے۔ بہتر ہے کہ یہ سات پارے طالب علم زبانی پڑھے اور روانی کے ساتھ پڑھے۔ غلطی والی جگہ پر نشان بھی لگائے اور کم از کم اس جگہ کو تین دفعہ دہرائے۔

۲) اس کے علاوہ تین پارے بطور منزل یاد کریں اور رات کو قبلہ رخ کھڑے ہو کر سنائیں.... جسے ہم "نفلوں میں سنانا" کہتے ہیں..... طلبہ کھڑے ہونے کی حالت میں ایک دوسرے کو سنائیں۔ وقفے وقفے سے ان کو بٹھاتے اور کھڑا کرتے رہیں۔ اس دوران استاد چلتے پھرتے ان سب کی نگرانی کرتا رہے اور ان کا سنتار ہے۔

۳) پھر اگلے دن صبح دس بجے ان سنائے ہوئے پاروں کا "دائروی جائزہ" لیا جائے۔

دائروی جائزہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی درسگاہ کے تمام طلبہ کو دائرے کی شکل میں بٹھادیا جائے۔ ایک طرف استاد بھی بیٹھ جائے۔ تمام طلبہ خاموش بیٹھ جائیں اور باری باری ایک ایک بچہ آئے۔ اس طالب علم کا رخ باقی طلبہ کی طرف ہو۔ اب اس سے اس کی سنائی ہوئی منزل میں سے ایک یا دو مقامات سے سنا جائے۔ یہ ایک بچہ پڑھ رہا ہو تو باقی سب اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے غور سے سنتے رہیں۔

اس طریق کار سے جائزہ لینے کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا مجمع اور مجلس میں تلاوت کرنے کی مشق ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ امتحان دینے کے دوران کا ڈر، خوف اور جھجک ختم ہو جائے گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس وقت کا سنایا ہوا مقام بہت پختہ یاد ہو جائے گا۔

امتحان دلوانا:

امتحان سے پہلے مختلف جائزوں میں ان سے ہر پارے میں سے زیادہ متشابہات والے رکوع پوچھتے رہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ امتحان میں اچھے نتائج اور سرخ روئی کے حصول میں نیکی تقوی، اخلاص اور دعا کا بڑا دخل ہے۔

امتحان کے بعد:

امتحان ہو جانا یا امتحان میں سو نمبر آجانا.... یہ کوئی منزل یاد ہونے کی ضمانت نہیں ہوتی، بلکہ امتحان تو گردان کے مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ہے۔ منزل کی مزید پختگی کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے اگر مدرسے کا سالانہ امتحان رمضان کے آخر میں رکھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ امتحان سے پہلے تین پارے منزل سنانے اور ساڑھے سات پارے تلاوت کرنے اور اس کے بعد جائزے کی جو ترتیب چل رہی تھی، وہ بھی جاری رہے۔

چلتے پھرتے منزل پڑھنا:

سال کے آخر میں طلبہ کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ چلتے پھرتے اور سنن و نوافل میں کثرت کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ ان کو اس کی عادت ڈالنے کے لیے نگرانی اور خصوصی تلقین کریں۔ انعام وغیرہ مقرر کر کے بھی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ

بچوں کو یہ عادت ڈلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ کی طرف سے بچے کے لیے یہ زندگی بھر کا عظیم الشان تحفہ ہوگا۔ اس کے حفظ کی حفاظت اور اپنی محنت کے ضیاع کے حوالے سے آپ مطمئن ہوسکیں گے۔ اس لیے اس کی خصوصی فکر فرمالیں۔

شبینہ کا عمل:

رمضان المبارک میں جماعت وار شبینہ سنانے کی ترتیب بنائی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر (آواز صرف سننے والوں تک محدود رکھتے ہوئے) کا انتظام کرلیا جائے۔ پھر فارغ ہونے والے بچوں میں سے کچھ کو آج کی رات کے لیے منتخب کرلیں۔ پہلا بچہ سنانا شروع کرے۔ چند بچے اس کی اقتدا میں کھڑے ہوں۔ اگر امام نابالغ ہو تو مقتدی بھی سب نابالغ ہوں۔ تربیت کی غرض سے ایسا کرلیا جائے۔ اب ایک جماعت تو نماز میں ہوگی۔ دوسری ذرا پیچھے دائرہ بنا کر بیٹھ جائے اور بغور سنتی رہے۔ کوئی ادھر ادھر گھوم نہ رہا ہو۔ انہی میں ایک طالب علم سنانے والے کی غلطیوں کی مکمل تفصیل نوٹ کرتا رہے۔ امام اپنی مقدار دو رکعتوں میں پوری کرے۔ اس کے بعد اگلا طالب علم آئے۔ آج ہی سارے بچے شبینہ نہیں پڑھیں گے، بلکہ استاد حسب مصلحت ہر روز چند سنانے والوں کی تعیین کردیا کرے۔

[حضرت کے ہاں اس شبینہ کا معمول ہے اور اس میں اپنے تمام حفاظ تلامذہ کو شریک کرتے ہیں۔ قرآنی باغ و بہار کا یہ سلسلہ اعتکاف کے دنوں میں مزید دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ جسے دیکھنا ہو وہ رمضان کی آخری راتوں میں اس منظر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرسکتا ہے۔ مرتب عفا اللہ عنہ]

رمضان المبارک اور مصلی سنانا:

رمضان المبارک میں پابندی کے ساتھ مصلی سنانا، قرآن کریم کو یاد رکھنے کا بہت آسان اور آزمودہ طریقہ ہے۔ لہٰذا گردان کے طلاب کو بھرپور ترغیب کے ساتھ اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ تاحیات پابندی کے ساتھ، بلا ناغہ مصلی سنانے کا اہتمام کرتے رہیں گے۔ چنانچہ فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے رمضان المبارک شروع ہونے سے پہلے تمام بڑے طلبہ کی

مختلف مقامات پر مصلی سنانے کی ترتیب بنائی جائے۔اگر مسجد یا کسی مکان میں مصلی سنانے کی جگہ نہ بن سکے تو مدرسے کے اندر ہی مختلف جگہوں پر انتظامات کر دیے جائیں۔اس کی ایک صورت یہ بھی ہے سوا سوا پارہ دو طالب علم دس دس تراویح میں سناتے رہیں۔

رمضان المبارک میں شعبہ گردان کے طلبہ کے لیے یہ ترتیب رکھی جائے کہ جو سپارہ رات کو تراویح میں سنانا ہے،وہ اور اس کے علاوہ بالترتیب دو دو پارے روزانہ صبح کے وقت یاد کرلیا کریں۔پھر تراویح والا پارہ ظہر کے بعد کھڑے ہو کر سنا دیا کریں۔وہ دو پارے جو ترتیب وار روزانہ یاد کریں گے،یہ تراویح سے واپس آ کر نوافل کی شکل میں روزانہ سناتے رہیں۔اس طریقے سے ان شاءاللہ طلبہ اپنا یہ پہلا مصلی اچھے انداز سے سنا کر اس معمول کی اچھی بنیاد رکھ سکیں گے۔نیز نوافل میں پڑھنے کی عادت اور مشق بھی ہو جائے گی۔

رمضان المبارک کے بعد:

رمضان المبارک کے بعد چونکہ ان بچوں نے دیگر شعبوں میں مشغول ہو جانا ہوتا ہے جہاں قرآن پاک کے ساتھ مشغولیت کم ہو جاتی ہے۔لہٰذا طلبہ کو الوداعی نصائح میں یہ وصیت بھی کردی جائے کہ وہ پوری فکرمندی اور پابندی کے ساتھ روزانہ کم از کم تین پارے تلاوت کا معمول رکھیں گے۔

''پانی پتی'' ایک معیار اور محنت کا نام

جن قراء و مدرسین کا تعلق ''پانی پتی'' سلسلے سے ہے، انہیں اس کا مطلب ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ''پانی پتی'' دراصل ایک معیار کا نام ہے۔ یہ ایک محنت کا نام ہے۔ آپ صرف اس نام کو ہی استعمال نہ کریں، بلکہ محنت کر کے دکھائیں، یہ معیار پیدا کر کے دکھائیں۔ پورے علاقے میں آپ کی درس گاہ شاندار معیار کا نمونہ ہونی چاہیے۔ اللہ نہ کرے کہ ہم اس روشن نام کی بدنامی کا باعث بنیں۔ اپنی درسگاہوں کو اس معیار پر لے آئیں۔ دور سے پتا چلے کہ یہ پانی پتی درسگاہ ہے۔ طرز، تجوید، تصحیح اور پڑھنے کے انداز وغیرہ کے حوالے سے آپ کی اپنے شاگردوں پر کی ہوئی محنت بتا رہی ہو کہ یہ آپ کا شاگرد ہے۔

یہ معیار پیدا کرنے کے لیے محنت کرنی ہوگی۔ اسباب کی اس دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی محنت کا حکم فرمایا گیا۔ ارشاد ہے: ''یا ایھا المدثر، قم فانذر'' [المدثر:2-1] ''اے کمبل اوڑھنے والے! کھڑے ہو جائیے، پس اللہ سے ڈرائیے لوگوں کو!'' اگر صرف دعاؤں سے کام چلتا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس ہاتھ اٹھا کر فرما دیتے کہ ''اے رب العالمین! تمام دنیا کے کافروں کو مؤمن بنا دے، سب کو ایمان دے دے۔'' بس اسی سے کام ہو جاتا۔ نہ طائف میں زخمی ہوتے نہ شعب ابی طالب میں محصور ہوتے۔ نہ مکہ سے نکالے جاتے نہ احد میں 70 جنازے پڑھتے۔ نہ غزوہ تبوک کے لیے چندہ مانگتے۔ مگر یہ سب کچھ ہوا اور آخر تک جاری رہا۔ اسی کی برکت ہے کہ آج قرآن پاک پوری دنیا میں پہنچ چکا ہے۔ سو، آپ دعائیں بھی کیجیے اور محنت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھیے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میرا تدریس کا ابتدائی دور تھا۔ کراچی میں میرے ساتھی ہیں قاری امان اللہ صاحب، جامعہ قاسمیہ پیر الٰہی بخش کالونی یونی ورسٹی روڈ والے۔ یہ میرے بہت بے

تکلف دوست ہیں۔ بڑے قابل اور متحرک ساتھی ہیں۔ ختم نبوت کے حوالے سے بھی ان کی خدمات ہیں۔ اُسی زمانے میں یہ ایک دفعہ میرے پاس آئے۔ صبح کا وقت تھا۔ درسگاہ لگی ہوئی تھی۔ میں نے دوپہر کو چھٹی کرنی تھی۔ ابتدائی ملاقات واکرام کے بعد میں نے ان کو اپنے ساتھ ہی درس گاہ میں بٹھالیا۔ کسی کی سبقی سنوائی تو کسی کی منزل کا جائزہ دلوایا۔ دوپہر تک ان کو طلبہ سے سنواتا رہا۔ دوپہر تک ان کو گفتگو کا موقع نہیں دیا۔ دوپہر کی چھٹی تک ہم دونوں تھک چکے تھے، لہٰذا آرام کرنے چلے گئے۔ ظہر کے بعد وہ رخصت لے کر چل دیے۔

اس کے بعد ملتان جا کر حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ سے ملے اور جا کر حضرت کو میرے متعلق بتایا کہ اُس سے مل کر آیا ہوں۔ حضرت نے بڑی دلچسپی سے پوچھا کہ کیا حال تھا؟ کام کیسا چل رہا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ میں گیا تھا لیکن انہوں نے کوئی "لفٹ نہیں کرائی۔" میرے جانے پر کوئی خاص توجہ اور زیادہ وقت نہیں دیا۔ حضرت نے پوچھا: آپ دونوں کی تو آپس میں بڑی بے تکلفی اور اچھا تعلق تھا، پھر ایسا کیوں ہوا؟ انہوں نے جواب دیا: پتا نہیں کیا ہوا میں جا کر بیٹھا تو انہوں نے مجھ سے گپ شپ کے بجائے مجھے طلبہ کی منزل سنوانی شروع کر دی۔ دوپہر تک اس کام میں مصروف رکھا۔ دوپہر کو چھٹی کی۔ وہ بھی سو گئے، میں بھی سو گیا۔ ظہر کے بعد میں نے سوچا کہ کہیں ابھی مطالعہ کھلوانے پر نہ لگا دیں، لہٰذا میں نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ انہوں نے بس اتنا ہی کہا کہ اچھا بھائی ٹھیک ہے۔

یہ سن کر حضرت بہت مسرور ہوئے۔ بعد میں قاری امان اللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ حضرت قاری صاحب نے بہت دعائیں دیں۔ اور بڑی دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ اور تعجب سے فرمایا کہ اچھا!!! اس نے اس طرح کیا ہے! درس گاہ کے وقت میں آپ سے ایک بات بھی نہیں کی!؟ یوں حضرت کو اس عمل سے بے حد خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے میرے ساتھ حضرت کی ایسے ہی وقتوں کی دعائیں اب تک چلی آرہی ہیں۔ میرا آج بھی یہ حال ہے کہ مجھے اگر کہیں امتحان لینے کا موقع ملے اور کوئی اچھا سنا دے تو ہر طرح کی تکلیف اور سفر کی تھکان بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اس لیے بھائی! آپ حضرات بھی بلاضرورت شدیدہ آمد ورفت کو ختم کر دیں، بغیر شدید ضروری کام کے نہ مہمان بننا مناسب ہے اور نہ ہی بلاضرورت آنے والے مہمان کو زیادہ وقت دینا مناسب ہے۔ آپ کا ایک مہمان تو راضی ہو جائے گا، لیکن مہمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وقت اور تعلیم ضائع ہوگی، اس کا جواب دہ کون ہوگا؟

پانچواں باب

تدریسی مشکلات اور ان کا حل

مختلف مدارس اور مکاتب قرآنیہ میں مدرسین اور منتظمین سے حضرت قاری صاحب کی تربیتی مجالس میں سوال وجواب کی نشستیں ہوئیں۔ ان میں سے اہم ترین کے انتخاب کے ساتھ انہیں من وعن پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتب عفا اللہ عنہ)

بچہ اگر چلتے چلتے رک جائے

سوال:

بعض بچے شروع سے بڑے اچھے چل رہے ہوتے ہیں، درمیان میں کوئی ایسا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے، خدانخواستہ ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے، پھر کوشش کے باوجود نہیں چل پاتے۔ ایسے بچے کو چلانے کے لیے کیا ترتیب اختیار کی جائے؟

جواب:

اس بارے میں ''آدابِ تلاوت'' جو کہ حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ اس میں حضرت نے اپنے تجربات کا نچوڑ لکھا ہے، اس میں اس چیز کا جواب یوں دیا گیا ہے:

''جس طرح پر ایک جسمانی نظام ہے، اس میں بعض دفعہ دماغ کی کیفیت بڑی اچھی ہوتی ہے، کبھی دماغ پر دباؤ ہوتا ہے، اسی طرح پیٹ کی کیفیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے، کبھی قبض تو کبھی اسہال، ورنہ معمول کے مطابق۔ روحانی نظام بھی اسی طرح ہے۔ اس میں بھی یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ کبھی قبض کی کیفیت تو کبھی بسط کی۔ جس طرح شیوخ اپنے مریدین کو ذکر اذکار تلقین کرتے ہیں۔ پھر سالک بعض دفعہ تو بڑے شرح وبسط کے ساتھ کرتا ہے، تاہم بعض

اوقات طبیعت اس طرف چلتی ہی نہیں ہے، تو فرمایا: اسی طرح علمی میدان میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک پڑھ رہا ہے۔ استاد بھی محنت سے پڑھا رہا ہے، لیکن نہ استاد کو پتا چلتا ہے کہ کون سی ایسی رکاوٹ آگئی ہے اور نہ ہی بچہ یہ سمجھ پاتا ہے کہ مجھے سبق کیوں یاد نہیں ہوتا؟ اس طرح استاد، بچہ اور والدین تینوں فریق پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ جس طرح پر وہ جسمانی قبض بچے کو ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ ایک علمی قبض ہوتی ہے۔ ایسے دنوں میں استاد کو چاہیے کہ بچے کا سبق کچھ دن، مثلاً: دو، چار، پانچ یا سات دن کے لیے روک دے۔ اس کے اوپر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ اس کی منزل وغیرہ سن کر تھوڑا بہت آگے چلاتے رہیں۔ صرف پانچ، سات یا آٹھ، دس دن کے بعد اس کی یہ کیفیت زائل ہو جائے گی۔ پھر آگے سبق اور دیگر معمولات شروع کر دیں۔

یہ ترتیب ایسے بچے کے لیے ہے جسے قبض کا مسئلہ درپیش ہو، لیکن اگر اس کی کیفیت اس قسم سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس کی وجہ بچے کی آوارگی ہے۔ یا گھریلو حالات اس کا سبب ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے والدین کو بلا کر اس کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انہیں کہا جائے کہ اس کو گھر میں یکسوئی والا ماحول مہیا کیا جائے، تاکہ اس کا ذہن پورا تعلیم کی طرف رہے اور اس کے ذہن سے انتشار ختم ہو جائے۔

منزل سننے کی مقدار کتنی ہو؟

سوال:

درجے میں منزل سننے کی مقدار متعین ہونی چاہیے یا کم وبیش بھی ہو سکتی ہے؟

جواب:

میں نے پہلے اس کی نشاندہی کر دی ہے کہ سننے، سنانے کا نظام مضبوطی کے ساتھ چل رہا ہے اور بچوں کے سپارے اچھے ہیں، پھر تو ایک معمول کے مطابق مقدار متعین ہو جائے تو بہتر ہوتا ہے، لیکن پھر بھی درجے میں اگر بیس بچے ہیں، دو تین ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کمزور

ہوتے ہیں، اگر ان کے سننے سنانے میں کمی کرلی جائے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

طالب علم مہمان کے سامنے جھجکتا ہے

سوال:

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں اچھی طرح سے یاد ہوتا ہے۔کوئی غلطی وغیرہ نہیں آتی لیکن کسی مہمان یا مجمع کے سامنے نہیں پڑھ سکتے، بھولنے لگتے ہیں؟

جواب:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کا تعلق مشق کے ساتھ ہے۔جس طرح بعض حضرات بڑے جید عالم ہوتے ہیں لیکن کہیں مجمع میں تقریر کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ویسے درس گاہ میں بیٹھے ہیں تو دو، دو تین، تین گھنٹے کا سبق اچھی طرح پڑھا دیں گے، مگر مجمع کے سامنے ان کے لیے چند منٹ کی گفتگو بھی دشوار ہو جاتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ الگ طور پر تقریر اور خطاب کی مشق نہیں کی ہوتی۔

لہٰذا اس مسئلے کے حل کے لیے بچوں کو الگ سے مشق کروانے کی ضرورت ہے۔جس کے لیے ایک تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ ایک سورت پورے درجے کے لیے متعین کردیں، مثلاً: "قل اعوذ برب الناس." ان سے کہہ دیں کہ بھئی! سب بچے اس کو یاد کرلیں۔پھر سب بچوں کو خاموش کروا کر اپنی درس گاہ میں ایک ایک بچے کو بلایا جائے۔ان سے کہیے کہ یہاں کھڑے ہو کر سناؤ! اگر ہر روز سب کا نہیں سن سکتے تو پانچ، سات بچوں کا ہر روز اسی طرح پر سنیں۔اس طرح ان کے اندر یہ عادت آہستہ آہستہ پختہ ہو جائے گی۔ان شاء اللہ!

اگر کسی کے لیے وقت متعین کرنا مشکل ہو

سوال:

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کسی بھی وجہ سے ان کے لیے درس گاہ کے معمول کے مطابق وقت

متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیا اس کی گنجائش ہے کہ ان کو عام روٹین سے علیحدہ طور پر چلایا جائے؟

جواب:

ہر بچے کے لیے اس کے مناسب حال پالیسی طے کی جائے۔ سبق کے اوقات تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بعض بچے کمزور ہیں تو سبق کے مقررہ وقت کے علاوہ میں ان کا سبق یاد کروالیا جائے۔ اس میں کوئی مشکل بھی نہیں۔ بچوں کی نفسیات کے اعتبار سے اس کا فیصلہ فرمالیا جائے۔

یاد کر کے جلدی بھول جاتے ہیں

سوال:

بعض بچے سبق یاد کرنے میں بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ بہت جلد یاد کر لیتے ہیں، صحیح سنا لیتے ہیں۔ جو پارہ ان کو منزل کا دیا جائے وہ بھی سنا لیتے ہیں، لیکن دو چار دن کے بعد وہی سنیں تو بالکل بھول جاتے ہیں یا اتنی غلطیاں آتی ہیں جیسے بالکل کچا ہو گیا ہو۔ یعنی "یاد کرنے" میں بڑے اچھے ہوتے ہیں، "یاد رکھ" نہیں سکتے.... ایسے بچوں کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب:

اس میں بعض دفعہ تو حافظے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بعض کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ورنہ دوسرے درجے میں وہ وجہ ہوتی ہے، جس کی میں نے پہلے نشاندہی کی کہ ان کا سننے سنانے کا نظام بگڑ چکا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کا آموختہ بھولتا جاتا ہے۔ اگر یہ وجہ ہو تو استاد پیچھے ذکر کی گئی ہدایات کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کر سکتے ہیں کہ چند دن استاد اس کا سبق سنے۔ قریب بٹھا کر یاد کروائے۔ اس طرح کچھ دنوں میں مسئلہ حل ہوتا نظر آئے گا۔

جبکہ اگر مسئلہ حافظے کا ہے تو اس کے لیے استاد کو چاہیے کہ انتہائی شفقت کے ساتھ بچے کو درج ذیل عملیات کی تلقین کرے:

☆...... ہر نماز کے بعد سورۃ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ" سات دفعہ پڑھ کر اپنے سینے پہ دم کرلیا کرے۔ ان شاء اللہ بھولنے کی شکایت نہ رہے گی۔

☆......دوسرا عمل حضرت قاری صاحبؒ نے ہمیں تلقین فرمایا تھا کہ 21 دفعہ "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ. وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ. وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ. یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ." فجر کی نماز کے بعد پڑھ کر پانی یا کسی چیز پر دم کر کے اس کو کھا یا پی لے اور اپنے سینے پر بھی دم کرلے۔ چالیس دن تک مسلسل یہ عمل کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ شانہ اس کے حافظے کی کمزوری دور فرما دیں گے۔

اگر استاد کمزور بچے کو نظر انداز کرے

سوال:

کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو کسی درجے میں کمزور ہوتے ہیں۔ اچھے بچوں کی طرف استاد کی توجہ کم بھی ہو تو بھی کام چل جاتا ہے، لیکن کمزور بچوں کی طرف استاد کی توجہ اس درجے کی نہیں ہوتی جس درجے کی انہیں درکار ہوتی ہے۔ اب استاد کو ذہنی طور پر کس طرح تیار کیا جائے کہ وہ ایسے بچوں پر خصوصی توجہ دے؟

جواب:

ان کو بتایا جائے: "تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَاءِ کُمْ" یعنی اگر تمہاری جماعت میں کچھ رونق ہے تو وہ ان ضعیف بچوں کی برکت سے ہی ہے۔ ان کی طرف توجہ کرو۔ اسی طرح پر انہیں بتایا جائے کہ ہسپتالوں میں بھی جو زیادہ کمزور ہوتے ہیں ان کو پہلے ایمرجنسی وارڈ میں رکھا جاتا ہے۔ وہاں پر خصوصی توجہ دے کر ان کو کسی قدر طاقت ور کیا جاتا ہے، پھر آگے منتقل کیا جاتا ہے۔

یہ جو میں نے ایک حدیث کی طرف اشارہ کیا: "تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَاءِ کُمْ" اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخص آیا کرتے تھے۔ یہ دونوں آپس میں بھائی تھے۔ ایک بھائی کاروبار کرتے تھے اور دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہتے تھے۔ جو کاروبار کرتے تھے، وہ دوسرے کے بارے میں یہ کہا کرتے کہ یہ سارا دن یہاں بیٹھا رہتا ہے، ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔ صرف کھانے کے وقت پہ آجاتا ہے۔ یہی شکایت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی لے آئے۔ عرض کیا: ''یارسول اللہ! انہیں کہیے کہ کچھ کام کیا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کاروبار والے بھائی کو مخاطب کر کے فرمایا: ہوسکتا ہے اسی کی برکت سے ہی تمہیں رزق مل رہا ہو۔''

(المستدرک للحاکم الشهيد:130/1)

لہٰذا ایسے اساتذہ کو چاہیے کہ کمزور بچوں کو نظر انداز نہ کریں۔ ان پر خصوصی توجہ دیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے تمہاری پوری درسگاہ کامیاب ہوجائے اور تمہارا پورا عمل قبول ہوجائے۔

سبق ٹھیک سناتا ہے، مگر منزل پر قابو پانا مشکل ہے

سوال:

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا سبق تو ٹھیک چل رہا ہوتا ہے۔ رفتار بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ سبق بھی یاد کر کے سنا دیتے ہیں، لیکن جب منزل کی باری آتی ہے تو باوجود کوشش کے ہمت نہیں کرپاتے؟

جواب:

ہمارے حضرت قاری صاحب ؒ ایسے بچوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے کہ انہیں سبقی پارے اور منزل کا پابند نہیں رکھتے تھے۔ سبق سن کر صبح ہی ان کو سنانے کے لیے بٹھا دیتے۔ غلطیاں جتنی بھی آجائیں اس کی پروا نہیں۔ لیکن بیٹھ کر سناتے رہو۔ دن میں تین سپارے ہر روز سنواتے تھے۔ سنوانے کی ترتیب یہ ہوتی کہ ایک پاؤ ایک لڑکے کو بلوا کر سنوا دیا۔ دوسرے پاؤ کے لیے کسی اور کو بلوالیا۔ یہ نہیں کہ اس کے تین سپارے سنوانے کے لیے ایک ہی لڑکے کو مخصوص کر دیا۔ اس سے بچوں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ عمل آپ اپنے بچوں پر دہرا کے دیکھیں، ان شاءاللہ کارگر ثابت ہوگا۔

پہلا مدرسہ چھوڑ کر آنے والے طالبِ علم کے لیے

سوال:

بعض بچے جو کسی دوسرے ادارے سے کچھ سپارے پڑھ کر آتے ہیں۔ انہیں منزل یاد نہیں ہوتی۔ ان کی منزل اور آگے سبق کے لیے کیا ترکیب اختیار کی جائے؟

جواب:

جب تک منزل یاد نہ ہو آگے چلنا دشوار کام ہوتا ہے۔ اگر آٹھ، دس سپارے پڑھ کر آیا ہے تو پہلے سپارے یاد کروائے جائیں، پھر آگے چلایا جائے۔ اس کے لیے سننے، سنانے کی ایک باقاعدہ ترتیب قائم کی جائے۔ یہ ترتیب امتحانی ہونی چاہیے۔ پیچھے دہرائی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اس کو امتحان دینے کا پابند کیا جائے۔ پارہ مکمل یاد ہونے پر امتحان دے، پھر پانچ پارے یاد کر کے امتحان دے۔

اگر کوئی بچہ 25، 26 سپارے مکمل کر کے آیا ہے اور بالکل آخر پہ پہنچا ہوا ہے، اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے آخری سپارے پڑھا کر قرآن پاک مکمل کرا دیں۔ اس کے بعد اس کو گردان پہ لگا دیں، تاکہ اس کا سنبھلنا آسان ہو جائے۔ زیادہ سپاروں کے ساتھ سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔

بچہ دلچسپی نہیں لیتا

سوال:

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جو خاص دلچسپی نہیں لیتے اور کوشش کے باوجود بھی اونچی آواز سے نہیں پڑھتے؟

جواب:

ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ "برکات" تو ہوتی ہی ہیں۔ ان کے لیے بھی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ اس کے ذہن کو پرکھیں کہ کون سی بات کو تسلیم کرتا ہے۔ کچھ پیار اور کچھ ڈانٹ ڈپٹ

سے ان کو لے کر چلیں۔اسے کہیں تھوڑا اونچی آواز سے سناؤ، ان شاء اللہ تجھے انعام ملے گا۔ کوئی نہ کوئی صورت کریں، ان شاء اللہ کسی نہ کسی وقت کامیابی ہو جائے گی۔

کند ذہن ہے اور عمر بھی بڑھ رہی ہے

سوال:

ایسا بچہ جو ذہنا کمزور ہے اور اس کی عمر بھی بڑھ رہی ہے۔ والدین کہتے ہیں ہم نے جلد فارغ کروانا ہے۔ استاد بھی فکر مند ہیں، لیکن اس کی عمر کے پیشِ نظر بظاہر یہی ہے کہ وہ نہ اِدھر کا ہے نہ اُدھر کا۔ ایسے طالب علم کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب:

ایسے طالب علم کو مجبور تو نہیں کر سکتے، لیکن ان کے والدین سے کہنا چاہیے کہ اس کے جلدی فارغ کروانے کا اصرار نہ کریں۔ اگر استاد سمجھتا ہے کہ ایک سال مزید لگا کر مکمل کر سکتا ہے تو پھر والدین کو یہی ترغیب دینی چاہیے۔ انہیں کہا جائے کہ اگر آپ نے اس کو کچا پکا فارغ کروالیا تو یہ بھول جائے گا۔ جو اس کے لیے دنیا و آخرت میں وبال ہوگا۔ عمر بھر کے لیے پریشانی رہے گی۔ لہٰذا فی الحال اس خواہش کی قربانی دی جائے۔

اگر کسی کے گھریلو حالات ایسے ہیں، کاروباری حالات ایسے ہیں، جس کی وجہ سے استاد بھی یہی سمجھتا ہے کہ فارغ کرنا ضروری ہے، ایسی صورت میں ان کا اصرار قبول کرلے، مگر ان سے یہ وعدہ لے کہ آدھا وقت آپ ہمیں ضرور دیں گے۔ بالکل فارغ رہنے سے بے شمار نقصانات متوقع ہیں۔ آدھے وقت کی شرط کے ساتھ ہم اس کو فارغ کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کے 8 گھنٹے پڑھائی کے ہیں تو اس میں وہ 4 گھنٹے آئے۔ کچھ پارے بھی سنائے تاکہ اس کا تعلق دو تین سال تک مضبوطی کے ساتھ رہے۔

اللہ کی ذات سے امید ہے ان شاء اللہ وہ اپنا حفظ پختہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا!

پانچ سبق علیحدہ سے کیوں؟

سوال:

''پانچ سبق'' الگ نہ سنے جائیں، بلکہ پورا سبقی پارہ ایک ساتھ سنیں تو کیا زیادہ بہتر نہ ہوگا کہ وقت بچے گا؟

جواب:

نہیں! یہ پانچ سبق علیحدہ ہی سنانے ضروری ہیں۔ اگر طالب علم ان پانچ اسباق کو سبقی پارہ کے ساتھ سنائے، تب بھی اس نے سنانے تو ہیں ہی۔ مگر ان کو علیحدہ سنوانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جو سبق سے متصل پانچ، چھ سبق ہوتے ہیں، وہی سب سے زیادہ کچے ہوتے ہیں۔ علیحدہ کر کے پھیرا دینے اور اہمیت کے ساتھ سننے سے وہ ان پر تقریباً اتنی ہی محنت کرے گا، جتنی سبق پر کرتا ہے۔ اس طریقے سے منزل اپنی بنیاد سے پختگی کے ساتھ چلے گی۔ اس کام میں کوئی بہت زیادہ وقت بھی نہیں لگتا۔ کوئی 5، 7 منٹ زیادہ لگ جائیں گے۔

فراغت کے بعد سننے، سنانے کی ترتیب کیا ہو؟

سوال:

اگر فراغت کے بعد بچے کے والدین اس کو کسی دوسری لائن میں لے جانا چاہیں تو ایسے بچے کے لیے قرآن پاک سنانے کی ترتیب کیا ہو؟

جواب:

فارغ ہونے کے بعد، اس کے والدین کی مشاورت سے ہی یہ کام ہوسکتا ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ والدین اس کو کس لائن میں لے کر جارہے ہیں۔ وہ اپنی اس مصروفیت میں سے کتنا وقت آپ کو دے سکتے ہیں۔ اسی حساب سے اس کی ترتیب بنائیں۔

☆☆☆

چھٹا باب

اساتذۂ فن کے سبق آموز واقعات

اساتذۂ فن کے سبق آموز واقعات کا یہ انتخاب حضرت اقدس، حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کی ڈائری اور ذاتی یادداشتوں سے پیش کیا جارہا ہے۔ ان میں شاطبیِ وقت حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمہ اللہ کی شفقتوں کا ذکر ہے تو مجددالقراآت حضرت قاری رحیم بخش رحمہ اللہ کے کمالات بھی مذکور ہیں، نیز حضرت صاحبِ کتاب مدظلہم کے زمانہ طالب علمی سے اب تک کے علمی و عملی سفر کی روداد بھی سامنے آتی ہے۔ کتاب کا یہ باب بھی انتہائی گراں قدر ہے۔ معزز و مکرم قارئین، خاص طور پر حضرت کے تلامذہ و متعلقین کے لیے اس میں بصائر و عبر کا بہترین سامان ہے۔ (مرتب عفا اللہ عنہ)

تذکرۂ اکابر کی مبارک مجلس

میرے گردان میں داخلہ لینے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک دن میں عشا کے بعد چھٹی کر کے گھر جانے کے لیے مسجد سے نکل رہا تھا۔ حضرت کے خادمِ خاص جو حضرت کے لیے چائے اور کھانا وغیرہ تیار کر کے دسترخوان بچھاتے تھے، ان کا نام صوفی عبدالستار صاحب تھا۔ ان کا گھر بھی حضرتؒ کے محلہ میں حضرتؒ کے قریب ہی تھا۔ رسالہ ''خدام الدین'' اور ''ترجمان اسلام'' فروخت کرتے تھے۔ دکانوں اور مکانوں پر جہاں جہاں متعین تھے، وہاں وہاں پہنچاتے تھے اور باقی وقت مسجد سراجاں میں حضرت کی خدمت میں ہی رہتے تھے۔

یہ صوفی عبدالستار صاحبؒ مجھ سے ملے اور مجھے لے کر کھڑے ہو گئے۔ فرمانے لگے: آپ کا کیا حال ہے؟ آپ کی تعلیم ٹھیک ہو رہی ہے؟ پھر محنت و شوق سے پڑھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد فرمایا کہ عشا کے بعد حضرتؒ کی خصوصی مجلس ہوتی ہے۔ اس میں آٹھ دس خصوصی افراد ہی شریک ہوتے ہیں۔ یہ بڑی نافع اور اہم مجلس ہوتی ہے۔ میں نے طلبا میں سے کسی اور سے یہ بات نہیں کہی، لیکن تیری شرافت اور سنجیدگی دیکھ کر

میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ تو بھی اس مجلس میں شریک ہوا کرے۔ میں نے کہا: آپ نے یہ بات تو بہت اچھی فرمائی ہے اور یقیناً حضرتؒ کی مجلس تو ہوگی ہی نہایت مفید اور بہت اچھی! لیکن مجھے تو اس طرح ایک خاص اور اہم مجلس میں شرکت کرتے ہوئے حجاب اور خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ بہت ہی خاص اور سنجیدہ لوگوں کی یہ مجلس ہے جبکہ میں کم عمر اور عقل وفہم کا بھی انتہائی کوتاہ ہوں۔ میں اس میں شرکت کیسے کرسکوں گا؟ معلوم نہیں میرا وہاں شریک ہونا حضرتؒ پسند بھی فرمائیں گے یا نہیں؟ فرمانے لگے: تجھے شریک ہونا چاہیے اور میں حضرتؒ سے اس کی اجازت لے دیتا ہوں۔ اتنی بات آپس میں ہوئی اور میں گھر چلا گیا۔ طے ہوا کہ کل کو ان شاء اللہ عشا کے بعد مجلس میں بیٹھیں گے۔

اگلے دن عشا کے بعد جب چھٹی ہوگئی، طلبا چلے گئے اور کمرے میں حضرتؒ کی مجلس شروع ہوگئی تو صوفی عبدالستار صاحب مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے اور ایک طرف سے پیچھے کونے میں بٹھا دیا۔ داخل ہوتے وقت حضرتؒ نے دیکھ لیا تھا لیکن انہوں نے اپنی بات جاری رکھی اور میری طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے۔ جب مجلس ختم ہوگئی تو صوفی عبدالستار صاحبؒ نے حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ محمد یاسین کی خواہش اور دلی شوق ہے، یہ چاہتا ہے کہ عشا کے بعد کی اس مجلس میں حاضر ہو جایا کرے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ شہری بچوں کو چھٹی کے بعد گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے، اگر یہ اپنے شوق اور چاہت سے بیٹھنا چاہے تو اس کی اجازت ہے۔

اس طرح جب عشا کے بعد طلبا چھٹی کر کے چلے جاتے تو میں دیگر حضرات کے ساتھ حضرتؒ کی مجلس میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتا اور جب مجلس ختم ہو جاتی تو اس کے بعد حضرتؒ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے تھے، بلکہ فوراً ہی گھر تشریف لے جاتے تھے۔ مسجد کے ایک کونے میں حضرتؒ کی سائیکل کھڑی ہوتی تھی۔ مسجد سے نکل کر ایک چھوٹی گلی کا تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ اس کے بعد تین چار سیڑھیاں نیچے اتر کر بازار تھا۔ مسجد سے بازار تک سائیکل نکال کر وہاں کھڑا کرنے کی خدمت بھی میں نے اپنے ذمے لے لی۔

مجلس ختم ہونے کے بعد میں حضرتؒ سے سائیکل کی چابی وصول کرتا اور سائیکل نکال کر

باہر سڑک پر کھڑا رہتا۔ جب حضرت تشریف لے آتے اور حضرتؒ سائیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف چلے جاتے تو میں وہیں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس عشا کے بعد کی حضرتؒ کی مجلس کا دورانیہ تقریباً زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا ہوتا تھا۔ اس مجلس میں صوفی عبدالستار صاحب، حافظ محمد اسحاق صاحب ملتانی، مولانا قاری محمد طاہر صاحبؒ، مولانا قاری محمد عبداللہ صاحب اور محلے کے نمازی حضرات میں سے کوئی 8، 10 اہم اہم ساتھی خود اپنے شوق سے مجلس میں شریک ہوتے تھے۔

یہ مجلس وقت اور افراد کے اعتبار سے انتہائی مختصر تھی۔ اس مجلس میں زبانی بات تو حضرتؒ کم فرماتے تھے، البتہ اکابر کے حالاتِ زندگی پر لکھی ہوئی کتابیں یعنی سوانح حیات پڑھ کر سناتے تھے، مثلاً تذکرۃ الرشید، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہندؒ وغیرہ۔ حضرتؒ خود پڑھتے تھے، جہاں کسی جگہ پر کسی بات کی وضاحت کی ضرورت پیش آتی تو کتاب سے ہٹ کر اس کی وضاحت فرماتے یا موقع محل کے مطابق کتاب سے ہٹ کر کوئی واقعہ ذہن میں ہوتا تو وہ بھی ساتھ سنا دیتے۔

مختصر یہ کہ یہ مجلس اکابرؒ کی یاد اور تذکروں کے ساتھ ہی خاص تھی۔ اس مجلس کے اثرات اس مجلس کے بڑے شرکا پر تو جو ہوتے ہوں گے، وہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن مجھ جیسا کم عمر اور کم عقل و فہم والا بھی اس مجلس کے انوارات و اثرات کھلی آنکھوں سے محسوس کرتا تھا۔ اپنے اکابر کا تعارف اور ان کی عظمت و محبت دل میں پیوست ہوتی رہتی تھی۔ الحمد للہ! آج 50 سال گزرنے کے بعد بھی اس مجلس کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔

کاش! آج کے معلمین اور مدرسین حضرات بھی اس ضرورت کو محسوس فرمائیں اور اپنے تعلیمی اوقات سے ہٹ کر بھی کچھ اوقات طلبا کے لیے عنایت فرمائیں، جن میں اکابرؒ کی خدمات، ان کا تذکرہ اور ان کا تعارف ہو۔

زمانۂ طالب علمی کے معمولات

حسین آگاہی میں قیام کے دوران ہم سب ساتھیوں کی ترتیب یہ تھی کہ صبح تہجد پڑھ کر

مطالعے میں مشغول ہو جاتے اور نماز فجر پڑھ کر اکثر ساتھی مدرسے تشریف لے جاتے، لیکن میں نے اپنی ترتیب یہ بنائی ہوئی تھی اور کبھی کبھی اس میں ساتھیوں میں سے کسی کو شریک کر لیتا تھا، وہ یہ کہ صبح اٹھتے ہی جب کہ باہر ہر طرف سناٹا ہوتا تھا، میں دوڑ لگاتا ہوا قلعہ کہنہ قاسم باغ کی طرف جاتا اور وہاں جا کر اسٹیڈیم میں دوڑتا ہوا کئی چکر لگاتا اور وہیں پر دوڑ کے دوران تیل کے ساتھ بدن کی مالش وغیرہ کر لیتا۔ پھر اسی طرح دوڑتے ہوئے واپس مسجد آجاتا۔

مسجد آکر پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہوتا۔ اس تمام عمل سے فارغ ہونے کے بعد بھی تہجد پڑھنے کے لیے کافی وقت بچ رہتا تھا۔ تہجد سے فارغ ہو کر اسباق کے مطالعے میں مشغول ہو جاتا اور نماز فجر کے بعد کا درس بھی میرے ذمے تھا، اس کی تیاری کرتا اور نماز فجر بھی میری ذمہ داری میں شامل تھی۔ نماز پڑھا کر، درس دے کر ناشتہ کر کے مدرسے چلا جاتا۔

میرا ناشتہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ رات کو عشا کے بعد اپنا آدھا سیر دودھ اُبال کر اس میں کدوکش کی ہوئی گاجروں کو ابال کر تھوڑا سا پکا لیتا۔ پھر کسی کھلی جگہ پر لٹکا دیتا۔ صبح تک گاجروں کی یہ کھیر ٹھنڈی ہو چکی ہوتی تھی۔ بس یہی تقریباً اکثر میرا صبح کا ناشتہ ہوتا تھا۔ گاجریں کدوکش کرنے کے لیے میں نے اپنے لیے ایک کدوکش خرید لیا تھا۔ جو اس وقت 4 آنے (پچیس پیسے) کا آیا تھا۔ وہ 1970ء میں میرے دورہ حدیث سے فارغ ہونے تک اسی مقصد کے لیے میرے پاس رہا۔ دورے سے فارغ ہونے کے بعد مدرس بننے تک اور اب (2009ء) تک میرے پاس موجود ہے اور گھر میں زیرِ استعمال ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ

یہاں پر ایک اور دلچسپ بات ذکر کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ ایک دن نماز فجر کے بعد حسبِ معمول میں ناشتہ کرنے میں مشغول تھا۔ مسجد سراجاں کے قریب رہنے والے ایک بزرگ حاجی گلزار صاحب جن کا بیٹا حافظ محمد الیاس ہمارے گردان کے سال کا ساتھی ہے، مجھے آکر ملے۔ حاجی صاحب پہلے بھی ملتے رہتے تھے، لیکن اُس دن ایک جلال کی سی کیفیت میں

میرے پاس آئے اور آ کر کہنے لگے:

''قاری صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں کہ اتنے دنوں سے کچھ پیسے مجھ سے بطور قرض لیے ہوئے ہیں، ابھی تک واپس نہیں کیے۔''

یہ انہوں نے اپنی طرف سے فرضی بات کہی تھی۔ میں حیران اور ششدر رہ گیا۔ پریشانی کی حالت میں کبھی حاجی صاحب کے چہرے کی طرف، کبھی ہاتھ اور کبھی پاؤں کی طرف دیکھتا ہوں۔ میری نظر مسلسل اسی طرف لگی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ حاجی صاحب کیا بات کر رہے ہو اور کس سے کر رہے ہو؟ یہ بات تو میرے متعلق نہیں ہے جو بات آپ کر رہے ہیں؟

انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی اس بات کو بڑے گرج دار انداز میں پانچ چھ مرتبہ دہرایا۔ پھر آخر میں کہنے لگے کہ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو میں آج ہی حضرت بڑے قاری صاحب سے شام کو ملوں گا۔ ان کی یہ آخری بات سن کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے کہ یہ شام کو میرے بارے میں بڑے حضرت سے بات کریں گے۔ اسی کشمکش میں تقریباً دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ حاجی صاحب موصوف میری طرف دیکھ کر ہنس رہے ہیں اور فرمانے لگے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تیرا علاج کرنا تھا وہ ہو گیا۔ یہ بات میں نے ویسے ہی فرضی کی تھی اور پوچھنے لگے کہ دیکھو غور کرو! وہ جو ہچکی تمہیں لگی ہوئی تھی، بند ہو گئی ہے کہ نہیں؟ میں نے غور کیا تو محسوس کیا کہ میری ہچکی بالکل بند اور ختم ہو چکی تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ اس دن صبح تہجد کے وقت سے ہی مجھے ہچکی بہت زیادہ آ رہی تھی اور نماز بھی چونکہ میں پڑھاتا تھا، نماز کے دوران بھی زیادہ آتی رہی اور بعد میں میں نے درس بھی دینا ہوتا تھا اس میں بھی بہت زیادہ آتی رہی۔ حاجی صاحب موصوف اس بات کو جان گئے کہ ہچکی بہت زوردار لگی ہوئی ہے۔ وہ میری اس ہچکی کا علاج کرنے کے لیے اندر کمرے میں تشریف لائے تھے۔

انہوں نے یہ باتیں کہیں اور ان کا یہ علاج خوب کامیاب ہوا اور میں نے اس کا مشاہدہ کیا۔

بعد میں فرمانے لگے کہ یہ میرے مجربات میں سے ہے اور میرے پاس ہچکی کا یہ بڑا کامیاب علاج ہے۔ جس کو ہچکی لگی ہوئی ہو اس کے اوپر ایسی کوئی بات فوری مسلط کر دی جائے

جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو۔ جس سے اس کا ذہن ہر طرف سے ہٹ کر صرف اسی بات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کو پندرہ بیس منٹ اسی بات میں الجھائے رکھو۔ میں نے خود بھی طلبا پر اور گھر کے کئی افراد پر بھی اس کا تجربہ کیا اور کامیاب پایا۔

مذکورہ دونوں واقعات میں اصل بات جو سامنے لانا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت کی برکت سے ہم سب مسجد سراجاں میں رہنے والے ساتھیوں کو ابتدائی زمانہ طالب علمی سے تہجد کا بہت زیادہ اہتمام تھا۔ اللہ کی محبت اور خوف تو ابھی تک نصیب نہیں ہو سکا۔ اللہ مجھے بھی اور متعلقین کو بھی کامل درجہ کا نصیب فرمائے۔ لیکن ظاہری طور پر حضرتؒ کا رعب اس قدر غالب تھا کہ تہجد چھوٹ جانے پر ان کے سامنے جواب دہی کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔

اللہ پاک مجھے بھی سب معلمین، متعلمین اور متعلقین کو بھی تہجد پڑھنے اور اس وقت میں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

بچوں کی تربیت کے لیے خصوصی مجلس قائم کرنا

شعبہ حفظ کے معلمین کے لیے ابتدائی بچوں کی ذہنی تربیت کے بہت مواقع میسر ہیں۔ اوسطاً 3، 4 سال ایک بچہ ایک ہی استاد کی خدمت میں حفظ کے دوران وقت گزارتا ہے۔ اتنی طویل مدت میں اگر 15 منٹ بھی استادِ محترم اس مقصد کے لیے خوب توجہ، شوق اور رغبت سے عنایت فرمائیں تو ابتدائی بچوں کی حفظ کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت کا کام بھی بہت بڑے پیمانے پر ہو سکتا ہے۔

اس وقت پاکستان کے چھوٹے بڑے مدارس میں لاکھوں کی تعداد میں طلبا و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ اساتذہ کرام فکر اور محبت کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جائیں تو لاکھوں بچوں کی ذہنی تربیت کا کام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پر شعبہ کتب کے مدرسین حضرات بھی اپنی جماعتوں کے اسباق کے دوران طلبا و طالبات کی ذہن سازی اور تربیت کو ضروری سمجھ کر کچھ وقت اس کے لیے صرف فرمادیا کریں تو علم وعمل سے مزین رجال کار بہت ہی بڑی تعداد میں

میسر آسکتے ہیں۔ اللہ کرے اس کی فکر ہم سب کو نصیب ہو جائے اور یہ فکر نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان عظیم ہو رہا ہے، ہمیں اس کا احساس ہو جائے۔

حضرت قاری صاحبؒ کو ایک مدتِ دراز تک ہم نے دیکھا کہ وہ اپنی حفظ وگردان کی جماعت کو کتاب ''تعلیم الاسلام'' سبقاً، بالاِستیعاب [مکمل] پڑھایا کرتے تھے۔ اکثر اس کے پڑھانے کا وقت عشا کی اذان سے تقریباً 15 منٹ پہلے ہوا کرتا تھا۔ پوری کلاس کے طلبا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قرآن مجید بند کر دیتے اور کتابیں ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتی تھیں۔ فوراً ہی تعلیم الاسلام کا سبق شروع ہو جاتا۔ کتاب کے مسائل یاد کروانے کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد اور اپنے اکابرؒ کے حالات کا بھی تذکرہ بڑے اچھے اور سادہ پیرائے میں ذہن نشین کروا دیتے تھے۔ مغرب کے بعد کی تعلیم چونکہ حضرتؒ کی مسجد سراجاں حسین آگاہی ملتان میں ہوتی تھی، جو بازار کے وسط میں واقع تھی۔ اس لیے بہت سے دکانداروں کے علاوہ قرب وجوار کے جو نمازی حضرات تھے، وہ بھی اس سبق میں شرکت کے لیے پہلے سے بڑی تعداد میں اپنے شوق کے ساتھ آجاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جماعت میں زیرِ تعلیم وہ طلبا جو قرآن پاک کے حفظ کے بعد کاروبار میں چلے گئے اور ان کو علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تو ان کو دیکھا گیا کہ موقع محل کے مطابق ضروری مسائل ان کو مستحضر ہوتے تھے۔ عقائد کے لحاظ سے خوب پختہ ہوتے تھے۔ تربیت کے اعتبار سے بھی بہترین لوگ ہوتے تھے۔ حالانکہ حضرتؒ دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ صدر وفاق المدارس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ خان محمد رحمۃ اللہ علیہ تعلیم کے دوران حضرت کے ہم عصر تھے۔ ان تمام صفات کے باوجود حفظ کی درس گاہ میں تعلیم الاسلام پڑھانے کو باعث عار نہیں، بلکہ اپنے لیے سرمایہ فخر سمجھتے تھے۔ ہم سب معلمین کو حضرتؒ کی زندگی کے اس پہلو سے بھی عوام وخواص اور چھوٹے بڑوں کی تعلیم وتربیت کے لیے کوئی راہ متعین کرنے کی کوشش کرلینی چاہیے۔

بچوں کو قرآن پاک کے مطالب بتانا

اسی طرح پر حضرت ؒ کی ایک عادت بچوں کی تربیت اوران کوعلم حاصل کرنے کے لیے تیار کرنے کی یہ بھی دیکھی کہ دوران تعلیم بچوں کو سبق کہلواتے ہوئے یا ان کا سبق سنتے ہوئے ان کو روکتے اور متوجہ فرماتے کہ دیکھو! جو آیات تم سن رہے ہو یا سنا رہے ہو اس کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے۔ اس ضمن میں حضرات انبیا علیہم السلام کے واقعات اور پہلی امتوں کے قصے بڑے سادہ انداز میں سناتے، پھر فرماتے کہ پڑھنے پڑھانے کا ثواب تو ہمیں مل ہی رہا ہے، لیکن اگر علم بھی حاصل کرلو تو پھر پتہ چلے گا کہ قرآن کس آیت میں کیا فرما رہا ہے۔ اس میں تدبر و تفقہ کی لذت بھی حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح پر قراآت متواترہ کے مختلف وجوہ بھی پڑھ کر سناتے اور ائمہ قراءت کے حالات زندگی بھی ساتھ ساتھ بڑے اچھے انداز میں بتاتے چلے جاتے۔ اس طریقے سے طلبا کو قراءت پڑھنے کی طرف شوق دلاتے اور متوجہ فرماتے۔ آج ہم ان کے سلسلے کے مدرسین حضرت ؒ کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا بے جا حوالہ اور تذکرہ تو کرتے رہتے ہیں ....ایسے لوگ دراصل اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بے جا حضرت ؒ کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا حوالہ دیتے ہیں....لیکن اس قسم کی صفاتِ کمال کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال! اگر اساتذ کے لیے ممکن ہو تو اس طریق کار کو حسب استطاعت اپنانے کی ضرور کوشش کی جائے۔ پھر دیکھیے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت، علم دین کی طرف میلان اور سکول و کالج کی جانب بے جا رجحان میں کس قدر کمی واقع ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اپنے ان اکابرؒ کی محبت واتباع کا کچھ ذرہ نصیب فرمائے، آمین۔

شدید تکلیف کے باوجود مصلی سنانے کا ناغہ نہ کیا

حضرت قاری صاحب ؒ قیام پاکستان سے پہلے بھی مسلسل قرآن پاک تراویح میں سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مسجد سراجاں میں سنا رہے تھے۔ میں شعبہ کتب میں تھا اور مسجد ہی میں

تھا۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ شعبان میں حضرت قاری صاحبؒ کے ہونٹ کے قریب ایک انتہائی تکلیف دہ پھوڑا نکل آیا، جس کی وجہ سے بولنا، کھانا، پینا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس پھوڑے کی وجہ سے چہرے میں، کان میں اور سر میں درد کی بہت زیادہ شدت تھی۔ شعبان کا آخری دن آ گیا، لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ تکلیف اور درد کی شدت بدستور موجود تھی۔ حضرتؒ نے ارادہ بلکہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اس دفعہ قرآن پاک تراویح میں سنانا بہت مشکل ہے، بلکہ متبادل کے طور پر سنانے کے لیے حافظ اسحاق صاحب کے چھوٹے بھائی قاری محمد یعقوب صاحب کو منتخب فرما لیا۔ آپ نے اپنے اس ارادے کے بارے میں اپنے شیخ حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ سے فون پر رابطہ فرمایا۔

ساری صورت حال بتائی اور اس چیز کی اجازت چاہی کہ تکلیف کی وجہ سے میں چونکہ نہیں سنا سکوں گا، اس لیے قاری یعقوب صاحب کو طے کیا ہے، اس کی اجازت عطا فرمائیں۔ حضرت شیخ نے حضرتؒ کی تمام بات سن کر فرمایا: مجھے گوارا نہیں ہے کہ آپ تراویح میں قرآن پاک نہ سنائیں اور فرمایا کہ میں دعا کرتا ہوں، آپ اللہ کا نام لے کر جیسے بھی ممکن ہو، ایک دفعہ سنانا شروع کر دیں۔ ان شاء اللہ تکلیف بہت جلد رفع ہو جائے گی۔ حضرتؒ اپنے شیخ کی منشا کو ٹالنے والے نہیں تھے، چنانچہ شیخ کے فرمانے پر وعدہ فرما لیا کہ آپ دعا فرمائیں، میں سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

شیخ نے فرمایا کہ میں دعا بھی کرتا ہوں، تاہم آپ لوگ وہاں سے فون کے ذریعے مجھے قرآن پاک سنانے کا انتظام کریں۔ انتظام کرنے والوں سے کہیں کہ جب تراویح شروع ہو تو مجھے فون ملا دیں۔ جو سپارہ تراویح میں پڑھا جائے گا، وہ میں نے پورا سننا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فون کا انتظام کر دیا گیا۔ حضرت شیخ نے حضرتؒ کا تراویح میں پڑھا ہوا سپارہ مکمل ٹیلی فون پر سنا۔ سپارہ ختم ہونے کے بعد تراویح کے بعد کچھ وقفے سے حضرت شیخ نے ٹیلی فون کیا اور بہت دعائیں دیں اور شاباش بھی دی۔ نیز فرمایا کہ ٹیلی فون پر سننے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کے دانتوں میں، منہ میں، چہرے پر کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تراویح شروع کرنے سے پہلے میری یہی کیفیت تھی کہ شاید میں ایک آیت بھی نہ پڑھ سکوں گا، لیکن جب تراویح کی نیت باندھ لی اور شروع کیا تو مجھے شیخ کی دعا کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ میں پڑھ رہا تھا اور پڑھائی کے دوران مجھے پھوڑے کی تکلیف کی شدت محسوس نہیں ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے فضل سے پڑھوا دیا۔ فرماتے تھے کہ تراویح کے فوراً بعد پھر مجھے تکلیف شروع ہوگئی۔ علاج بھی جاری تھا، تین چار دن یہی کیفیت رہی۔ الحمدللہ اس کے بعد پھر ٹھیک ہوگیا۔

اس میں ہم جیسے غافل اور کاہل حفاظ کے لیے بہت سبق ہے کہ اول تو سنانے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے یا پھر تھوڑی سی تکلیف پر بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں کہ ہم نہیں سنا سکتے۔ اس واقعے میں ہر حالت میں شیخ کا حکم پورا کرنے کا ہمیں سبق مل رہا ہے۔ اللہ ہمیں بھی اپنے اساتذہ اور شیوخ کی اتباع کا ذرہ نصیب فرمائے۔ آمین! حالات سازگار نہ ہوتے ہوئے، مشکلات کے باوجود جب شیخ کے حکم کو مقدم رکھا جائے گا تو یقیناً شیخ کے دل سے نکلی ہوئی دعائیں اور ان کی توجہات اپنا اثر دکھائیں گی۔

[مرتب عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس حضرت قاری محمد یاسین صاحب مدظلہم العالی نے حسبِ عادت اپنے اکابر و اساتذہ کا ذکر تو فرمایا، مگر اپنے معمول کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان اکابر کا دور قرآن کی بہاروں کا دور تھا تو ہمارے ممدوح حضرت قاری صاحب کو اس خزاں کے دور میں اپنے اکابر کے نقوش پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ آپ کا تراویح سنانے کا ایک بھی ناغہ نہیں ہوا۔ ایک بار اس قدر شدید بیمار ہوئے کہ ریڑھ کی ہڈی میں شدید تکلیف تھی۔ مکمل صاحب فراش ہوگئے۔ وصیت لکھ لی گئی۔

مگر آپ کی کرامت کہ رمضان آنے پر تراویح میں قرآن پاک کی تکمیل کا ناغہ نہ ہوا۔ اس عمر میں بھی ہر سال ان کی صحت کے پیش نظر بعض دفعہ دیکھنے والوں کا گمان یقین میں بدلنے لگتا ہے کہ شاید امسال نہ سنا سکیں۔ رمضان کے قریبی دنوں میں آپ کی بے چینی بھی دیدنی ہوتی

ہے۔آپ ہزار اعذار کے باوجود ہمت کر کے جائے نماز پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔لوگ دنگ رہ جاتے ہیں جب آپ اللہ کے خصوصی فضل وکرم سے 28ویں شب کو مکمل کر کے شاداں و فرحاں لوٹ رہے ہوتے ہیں۔

آپ یہ سن کر یقیناً حیران ہوں گے کہ 1432ھ، 2010ء میں آپ ''پہلی بار رمضان المبارک کے'' عمرے کے لیے تشریف لے گئے۔وہیں آپ کسی جگہ پھسلے اور سخت چوٹ آگئی۔ لہٰذا بظاہر حالات ہرگز سازگار نہ تھے۔ایک سفر اور پھر چوٹ کی وجہ سے صحت بھی متاثر۔مگر ہر ایک قیاس آرائی کے برعکس آپ نے واپس پاکستان آکر اس مرتبہ ایک نہیں، دو مصلے سنائے۔ حق تعالیٰ ہمیں ان حضرات کی ہمت، عشقِ قرآن اور استقامت کا کوئی ذرہ نصیب فرمائے۔]

ایک کڑی آزمائش اور ثابت قدمی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم ومحنت کا شہرہ اب شہر سے متجاوز ہو کر بیرون شہر منتقل ہو رہا تھا۔ عاشقِ قرآن جناب سیٹھی صاحب.... اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائیں۔آمین .... نے قرآن پاک کی اشاعت کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ملک بھر میں پسماندہ علاقوں میں اور سعودیہ میں بہت سے مدارس قرآن قائم کیے۔ان کے خلوص میں شک نہیں لیکن ان کا اپنا ایک طریق کار تھا۔حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ.... مولانا خیر محمد صاحب.... کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔

ایک دفعہ مدرسے میں تشریف لائے۔ان دنوں میں حضرت کی تنخواہ غالباً 50 روپے تھی۔ سیٹھی صاحب، مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگے کہ آپ کے پاس تو آدمیوں کی کمی نہیں ہے، آپ خود بھی موجود ہیں۔آپ تو کسی سے بھی کام چلا سکتے ہیں۔آپ ایسا کریں کہ قاری رحیم بخش صاحب کو ہمیں دے دیں۔آپ کو تو ان کا نعم البدل کسی نہ کسی طریقے سے مل جائے گا، ہمارے لیے مشکل ہے۔یہ ہمارے کام کو سنبھال لیں گے تو ہمیں آسانی ہو جائے گی۔مہتمم صاحب مدظلہ نے سنجیدہ ہو کر فرمایا کہ مشاہرہ وغیرہ کیا دیں گے؟

سیٹھی صاحب نے کہا کہ دوسو روپے تنخواہ اور اس کے علاوہ مزید مراعات کا بھی ذکر کیا۔ علاوہ ازیں خیر المدارس کے لیے 5 ہزار روپے ماہوار چندہ بھی اسی وقت سے شروع کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ بڑے ہی حکیم و دانا تھے۔ یہ نہیں فرمایا کہ نہیں، نہیں! ہم نہیں دے سکتے، ہمارا کام نہیں چلے گا۔ بلکہ سیٹھی صاحب کو لے کر حضرت کے پاس تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہ سیٹھی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سیٹھی صاحب نے حضرت کے سامنے پوری تفصیل اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ بات رکھی۔ حضرت نے بغیر کسی تاخیر کے بلا تامل فرمادیا کہ سیٹھی صاحب آپ کی محبت کا شکریہ، لیکن جگہ کی تبدیلی میرے لیے مشکل ہے اور آئندہ اس بارے میں سوچیں بھی نہیں۔

اس واقعے کے چند دن بعد حضرت مہتمم صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ میں مزید 30 روپے کا اضافہ از خود فرمادیا۔ اس طرح پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ 80 روپے ہو گئی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ میری پہلی اور بہت بڑی آزمائش تھی۔ ان دنوں میری معاشی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے صبر و استقامت عطا فرمائی اور اس الیے سے مجھے محفوظ رکھا۔

حفظ کی تدریس کیوں اَفضل ہے؟

حضرت رحمہ اللہ کا طریقہ تعلیم انوکھا تو تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ محنت، پابندی اور جانفشانی بھی حضرت کی ذات کا جز ولاینفک تھا۔ ان تمام خوبیوں نے بہت جلد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کارکردگی کو منظر عام پر لا کھڑا کیا۔ شروع شروع میں حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب کڑی نگرانی رکھی اور کام کو خوب پرکھتے تھے۔ جب بھی کوئی اہم ''مہمان قاری صاحب'' تشریف لاتے تو حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو لے کر خصوصاً حضرت کی درس گاہ میں تشریف لے آتے اور مہمان قاری صاحب سے فرماتے کہ طلبا سے سنیں۔ اسی طرح پر مختلف اوقات میں مختلف حضرات سے امتحان دلواتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ

اللہ علیہ قائل ہوگئے۔

شروع میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا شوق شعبہ کتب کی طرف تھا اور استعداد بھی خوب اعلیٰ تھی۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونا اپنی جگہ پر فخر کی بات تھی۔ بعد میں پھر مختلف قراءت و تجوید سے متعلقہ عربی قصیدوں کی شروح اور خصوصاً ''طیبہ'' جیسی مغلق کتاب کی حضرت کے ہاتھوں بہترین شرح کے منظر عام پر آنے سے تو عربی کی استعداد کا ہر خاص و عام نے لوہا مانا۔ بہر حال! حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی علم ہوگیا کہ حضرت یہ چاہتے ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے خود تو حضرت سے کچھ نہ فرمایا، البتہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ مولانا کاندھلویؒ حضرتؒ کے دارالعلوم دیوبند کے استاذ بھی تھے۔

مولانا موصوف نے حضرت سے ملاقات کی اور قرآن پاک کی فضیلت اور اس کی خدمت کے فضائل جو وہ بیان کر سکتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ سو، بیان کیے۔ اسی دوران انہوں نے یہ بھی فرمایا: ''أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ''۔[البقرة:61] مطلب یہ ہے کہ کیا آپ ایک اعلیٰ درجے کی چیز کو کم درجے کی چیز سے بدلنا چاہتے ہیں؟ اس کے بعد سے حضرت نے یکسو ہو کر پوری توجہ خدمتِ قرآن کے لیے ہی مخصوص فرمادی اور آخر دم تک اس پر ثابت قدم رہے۔

بیماری کی شدّت میں پابندی کی برکت

غالباً 1958ء کی بات ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس سال ''وجع المفاصل'' (جوڑوں کا درد) کی تکلیف ہوئی۔ یہ تکلیف اس قدر شدید تھی کہ نہ ہاتھ سے لوٹا وغیرہ سنبھال سکتے تھے اور نہ ہی لکھنے کے لیے قلم وغیرہ پکڑ سکتے تھے۔ ان دنوں حضرت کے بڑے داماد برادر محترم قاری محمد یٰسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کراچی والے حضرت کے پاس گردان کر رہے تھے۔ یہی صبح کو گھر سے سائیکل پر لے کر آتے اور رات کو گھر پہنچا کر آتے۔ ان دنوں حضرت کا رات کا اکثر حصہ تکلیف میں بیٹھ کر اور جاگ کر گزرتا تھا۔

حضرت رحمہ اللہ نے خود بتلایا کہ ان دنوں میں تہجد کے وقت بہت زیادہ منزل کا معمول بن گیا تھا۔ اکثر 5،5 پارے تہجد میں تلاوت کرتا تھا۔ تقریباً 9 ماہ تک یہ شدید تکلیف رہی، لیکن ان ایام میں بھی درس گاہ سے ایک دن کا ناغہ نہیں ہونے پایا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس قدر تکلیف میں پابندی کی یہ برکات ظاہر ہوئیں کہ اس سال پڑھنے اور فارغ ہونے والوں میں سے تقریباً سب کے سب ہی بہت اچھے مدرس بنے ہیں۔ قاری محمد یٰسین صاحب کراچی والے، قاری سیف الدین صاحب حال مقیم مکہ مکرمہ اور قاری اللہ بخش صاحب حال مقیم مدینہ منورہ جو کہ مالی غلام رسول کے بیٹے تھے، یہ اور ان کے علاوہ باقی اور بہت سے بہترین مدرسین اسی سال کے فارغ ہونے والوں میں سے ہیں۔

استاد کی غیر موجودگی میں ان کی تعظیم اصل چیز ہے

عظمت کا دعویٰ تو بہت آسان ہے، لیکن اس کی حقیقت اس وقت سامنے آتی ہے جب اپنی خواہش اور شیخ کے حکم و منشا میں تقابل ہوتا ہے۔ تقابل کے وقت صحیح فیصلہ کرنا اور اپنے کو اطاعت میں رکھنا ہی اصل چیز ہے۔ ایسے وقت میں اگر اپنی خواہش پر عمل پیرا ہوا اور اپنے شیخ کی خواہش و حکم کو پس پشت ڈال دیا تو یہ محبت، عظمت اور فرماں برداری کے خلاف ہے۔ اگرچہ شیخ کو اس کا علم بھی نہ ہوا اور جس نے تقابل کے وقت اپنی خواہش کو قربان کر دیا اور شیخ کی منشا و حکم کو مقدم رکھا، صحیح معنی میں یہی شخص فرماں بردار اور محبت و عظمت کو قائم رکھنے والا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نافرمانی اور فرماں برداری کی صورت میں برے اور اچھے اثرات مرتب ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کو بھی اس کی نافرمانی اور فرماں برداری کی اطلاع ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ آج کل تعلیم و تعلم کے معاملے میں جو ناہمواری اور بے برکتی نظر آ رہی ہے، اس کی سب سے اہم، بڑی اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے دلوں سے اساتذہ و شیوخ کی رضا و ناراضگی کی اہمیت نکل گئی ہے۔ وَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ.

بڑوں کی شفقتیں، سعادتوں کی بارات

1970ء میں دورہ سے فراغت کے بعد حضرتؒ نے میری تقرری رحیم یار خان مدرسہ تجوید القرآن میں فرمائی۔ سال پورا ہونے سے قبل فرمایا: ''بڑے حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ سے رابطہ کرو۔ التجا کرو اور عرض کرو کہ یہ میرا پہلا سال ہے اور پہلا امتحان ہے، آپ امتحان کے لیے تشریف لائیں۔'' حضرت کے فرمانے اور متوجہ کرنے پر میں نے بڑے حضرت سے مؤدبانہ پرزور درخواست کی۔ حضرت نے تشریف لانے کا فیصلہ فرمالیا۔

امتحان شروع فرمایا اور مجھے پاس ہی بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ کمی کوتاہی پر ساتھ ساتھ ہی متوجہ فرماتے رہے۔ ایک بات خوب یاد ہے کہ طلبا سے متعدد جگہ سے سنا۔ ہر طالب علم ہر نئی جگہ، تعوذ سے شروع کرتا۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''یاسین! تیرے شاگردوں کے پاس تو شیطان بالکل نہیں آتا ہوگا۔'' مقصد اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ درمیان میں اگر غیر کلام واقع نہ ہو تو تعوذ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس موقعۂ امتحان پر بہت ہی شاباش اور بہت ہی دعائیں عطا فرمائیں۔ امتحان سے فارغ ہو کر ملتان تشریف لے گئے۔ وہاں پر حضرت قاری رحیم بخش صاحب کو بتایا اور کام کی تعریف فرمائی۔ جس پر حضرت کو بہت خوشی ہوئی۔ حضرت نے بڑے حضرت کی طرف سے کام کی تعریف اور اپنی خوشی سے بھرپور ایک خط لکھا اور تاکید فرمائی کہ جو قابل اصلاح باتیں حضرت نے ذکر فرمائی ہیں، پوری محنت سے اصلاح کرو۔

رحیم یار خان میں میرا قیام مختصر تقریباً دو سال ہی رہا۔ اس کے بعد حضرت نے فیصل آباد میں تقرری فرمائی۔ باغ والی مسجد میں۔ دو سال بعد بڑے حضرتؒ کی خدمت میں امتحان کی درخواست کی گئی۔ حضرت ایک ہفتہ کے لیے تشریف لائے۔ ایک ہفتہ میرے پاس باغ والی مسجد میں قیام فرمایا۔ محدود طلبا تھے۔ حضرت رحمہ اللہ نے بہت وقت صرف کر کے تفصیل سے امتحان لیا۔

امتحانی ہفتے کے بعد مجلس امتحان میں موجود احباب سے فرمایا: ''ماشاء اللہ! یاسین نے فیصل آباد کو ملتان بنادیا ہے۔'' حضرت کے یہ ارشادات سننے والے اب بھی موجود ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ کا یہ اعتماد میرے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس وقت تک مدرسہ کا کوئی نام بھی نہیں تجویز ہوا تھا۔ جب رپورٹ لکھوانے لگے تو پوچھا کہ مدرسے کا نام کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ نام تو ابھی تک کوئی نہیں رکھا۔ اتفاق کی بات حضرت کے ساتھ آنے والے خدام میں ایک کا نام ضیاء الدین صاحب تھا اور وہی رپورٹ لکھنے کے لیے بیٹھے تھے۔ جب عرض کیا گیا کہ مدرسہ کا نام تو کوئی نہیں۔ فرمایا: ''جناب ضیاء صاحب! پھر مدرسہ کا نام ضیاء القرآن ہی رکھ دیتے ہیں۔'' اس طرح یہ حضرت کا تجویز کردہ نام [مدرسہ ضیاء القرآن باغ والی مسجد] رکھ دیا گیا۔

- میں نے ہمیشہ اس بات کو ادب کے خلاف سمجھا کہ حضرت موجود ہوں اور حفظ کی سند میں جاری کروں۔ حضرت کی حیات میں میری پوری کوشش رہی کہ جو میرے پاس حفظ کرے وہ گردان حضرت کے پاس ملتان خیر المدارس میں کرے۔ 1982ء میں حضرت کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد اپنی طرف سے سند جاری کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

ساتواں باب

تربیتِ طلبہ کے رہنما اصول

تربیتِ طلبہ کے لیے اہم نصائح

اس کتاب کا اصل موضوع مدرسین کی خصوصی تربیت اور طریقہ تدریس کی وضاحت ہے۔ اس لیے کہ معاشرے کی صحیح خطوط پر تربیت کا سرچشمہ اساتذہ کرام ہی ہوتے ہیں۔ گزشتہ چھ ابواب میں اس سلسلے کے متعدد پہلو آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ یہ ہدایات ہمیں مسلسل مواعظ کی شکل میں میسر آئیں۔ لہٰذا انہیں مرتب انداز میں جزوِ کتاب بنادیا گیا۔ تاہم کتاب ترتیب دینے کے بعد اس قدر تشنگی محسوس ہوئی کہ "طلبہ کی تربیت" کے حوالے سے بھی محترم مدرسین کے لیے روشنی کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس باب کی حیثیت مضمون پڑھنے کے بعد اس کی عملی مشق کی سی ہے۔ آپ نے گزشتہ ابواب میں جو تربیت حاصل کی، اب اپنے طلبہ پر ان اصولوں کو جاری کرنے کے لیے اس باب کے مندرجات ملاحظہ فرمایئے۔ بقیہ کتاب کی طرح اس باب میں بھی اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ تمام باتیں حضرت قاری صاحب مدظلہم العالی کی بیان فرمودہ ہی شامل کی جائیں۔ اس ساتویں باب کے آخر میں بطورِ ضمیمہ مختلف موضوعات اور عنوانات بھی لکھ دیے گئے ہیں، تاکہ اساتذہ کرام ان کی روشنی میں طلبہ کی تربیت کے لیے سلسلہ وار مذاکرہ/ بیان فرماسکیں۔ (مرتب عفا اللہ عنہ)

اگر ایسا ہو جائے....

یہ عجیب بات ہے کہ آج مدرسین کی تربیت کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ چند دہائیاں قبل تک اس کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ ایک فارغ التحصیل فاضل، تعلیم میں رسوخ پیدا کرنے کے ساتھ اپنے اساتذہ کی سیرت و کردار کو بھی اپنے اندر جذب کر چکا ہوتا تھا۔ پھر وہ انہی خطوط پر اپنے طلبہ کی تربیت شروع کر دیتا۔ عجیب کہ آج اساتذہ خود تربیت کے محتاج ہو گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج طلبہ بھی لولے لنگڑے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی تعلیم معیاری ہے نہ تربیت مثالی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر مدرسین اپنے آپ کو سنوار لیں تو اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے کہ آپ طلبہ کی تربیت کیسے کریں؟ طالب علم استاذ کی عادات واطوار غیر شعوری طور پر اپناتا ہے۔ اس لیے آپ طلبہ کی تربیت چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو مثالی بنا کر طلبہ کے سامنے پیش کر دیں، امید ہے کسی اور نصیحت اور تربیت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

آج کے دور میں ''تدریب المدرسین'' وغیرہ کے عنوان سے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بہت اچھا عمل ہے، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ لیکن جس طالب علم کی زمانہ طالب علمی میں ہی مضبوط سننے سنانے، غلطیاں وغیرہ نکالنے کی مشق کروادی گئی ہو، تعلیم و تدریس کے اعتبار سے ان کے ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ صفت ہمارے حضرت رحمہ اللہ علیہ کی درسگاہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی درسگاہ سے پڑھ کر نکلے ہوئے جس شہر، صحرا، جنگل جہاں بھی بیٹھ گئے انہوں نے اپنے شہر میں اپنی تعلیم و تدریس کے بہترین نتائج کے ذریعے لوگوں کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ مضبوط اور معیاری حفظ کا نظام اسی پانی پتی سلسلے میں ہے۔

ماں کی گود میں......

ہمارے ہاں مختلف عمروں کے بچے آتے ہیں۔ کچھ بڑی عمر کے ہوتے ہیں جن میں سے بعض پہلے سے تربیتی نقائص لے کر آتے ہیں۔ بعض کی مثال بالکل سفید کپڑے کی سی ہوتی ہے۔ جن کی آرائش کر کے ہم نے قابل دید بنانا ہوتا ہے۔ بہر حال! بچے جس قسم کے بھی ہوں، وہ اپنی ساخت و پرداخت میں ہماری خصوصی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اساتذہ طلبہ کو بچہ سمجھ کو چھوڑ دیتے ہیں کہ بڑے ہوں گے تو خود ہی سیکھ جائیں گے۔ وہ ان کی تربیت سے غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سنگین غلطی ہے۔ کیونکہ طالب کی مثال ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح پیدائشی نقص دور نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اگر 8،10 سال مدرسے میں گزارنے والا طالب علم بہترین تربیت سے محروم رہا تو معاشرے میں جا کر یہ کیا گل کھلائے گا؟"

اسی طرح پر شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا: "زمانہ طالب علمی کی تربیت ہی زندگی کی آخری سانس تک کام آتی ہے۔" لہذا ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے طلبہ کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دے۔

تربیت یافتہ کی مثال

ظاہری خوبصورتی سے زیادہ ضروری باطنی اوصاف کے ساتھ مزین ہونا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پھل دار درخت عموماً ظاہری خوبصورتی سے خالی ہوتے ہیں، جبکہ بے پھل درخت اس کے برعکس۔ جیسے سرو کا درخت، جس کا شیخ سعدی نے بھی "کریما" میں تذکرہ فرمایا ہے، لیکن عامۃ الناس کے لیے زیادہ مفید پھلدار درخت ہی ہوتے ہیں۔

بالکل اسی طرح ہم اگر چہ ظاہری بناوٹ سجاوٹ نہ بھی رکھتے ہوں، مگر تربیت یافتہ ضرور ہوں تو یہ اچھا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہم اپنے قول وعمل سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے

والے ضرور ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے اپنی بری عادات کو یکسر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ ہماری تربیت میں مخل ہوتی ہیں۔

چھٹی دینے سے پہلے....

طالب علم کو چھٹی دینے سے پہلے اچھی طرح سمجھائیں کہ اس میں آپ کی تعلیم کا حرج ہے۔ اگر اس کے بغیر گزارہ ہوسکتا ہے تو رک جائیں، چھٹی نہ کریں۔

ہم نے حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول دیکھا کہ جب کوئی ان سے چھٹی لینے کے لیے آتا تو اسے صرف شدید ضروری کام کے لیے چھٹی دیتے۔ ساتھ ہی فرماتے: "حافظ قرآن کا چھٹی سے کیا تعلق ہے؟ اسے تو وہاں بھی چھٹی نہ ہوگی جہاں لوگوں کو ہر عمل سے چھٹی مل جائے گی۔" اشارہ تھا اس حدیث پاک کی طرف کہ "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حافظ قرآن سے فرمائیں گے: اِقرأ وارْتَقِ وَرَتِّل کَمَا کُنْتَ تُرَتِّلُ فِی الدُّنیا". یعنی "ترتیل کے ساتھ پڑھتا جا اور جنت کی سیڑھیاں چڑھتا جا۔ جس طرح کہ تو دنیا میں ترتیل کے ساتھ تلاوت کیا کرتا تھا۔" (صحیح ابن حبان:39/4)

امتحانات میں تلاوت موقوف کرنے کی روایت

شعبہ کتب کے بعض طلبہ امتحان کے ایام میں تلاوت موقوف کر لیتے ہیں۔ وہ ان دنوں میں اس تلاوت کو تیاری میں مخل سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا اسکول و کالج کے طلبہ امتحان کے دنوں میں نماز و تلاوت کا اہتمام شروع کردیتے ہیں۔ جن دنوں میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ لو لگانے کی ضرورت ہوتی ہے ہم اس سے اپنے آپ کو فارغ کر لیتے ہیں۔ یہ تو بڑا دھوکہ ہے۔

ہم نے حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں سنا بھی اور مشاہدہ بھی کیا کہ اگر ان کے پاس کوئی صاحب اپنی پریشانی بیان کرتے تو آپ فرماتے: "لگتا ہے آپ نے ان دنوں تلاوت چھوڑ دی یا کم کردی ہے۔ اگر ان 2 میں سے کوئی صورت نہیں تو پھر مقررہ مقدار پر کچھ مزید اضافہ کرلو۔ آپ رحمہ اللہ کا یہ عمل اس حدیث کے پیش نظر تھا کہ "جس جگہ

تلاوت ہوتی ہے وہاں اللہ کی رحمت اترتی ہے۔'' لہٰذا امتحان کے دنوں میں کم یا موقوف کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کرنا چاہیے۔

امتحانی ہدایات

اساتذہ کی دعائیں طلبہ کی تربیت کے لیے تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں کے لیے خصوصی دعا کیا کریں۔ امتحان کے زمانے میں خصوصی تیاری کروائیں۔ انسان کے گناہ اس کی کامیابی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ طلبہ کو بے ادبی، معاصی اور بدمحنتی سے بچنے کی تلقین کریں۔ پرچہ حل کرنے کا طریقہ بھی بتادیں۔ ان کی وضع قطع پر نظر رکھیں۔ انہیں مختلف اذکار اور خصوصی دعائیں بتلائیں، مثلاً: سورۃ قریش اور سورۃ الم نشرح پڑھ کر دم کریں۔ آخر میں درود شریف اور حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل کثرت سے پڑھنے کی تلقین کریں۔ طلبہ کو یہ ہدایت بھی کریں کہ پرچہ مکمل کر لینے کے بعد حل شدہ پرچے پر نظر ثانی ضرور کرنی چاہیے۔

جذبہ بڑھانے کے لیے

یوں تو اپنی تعریف اور کارناموں کا تذکرہ مناسب نہیں ہوتا۔ تاہم کسی خاص موقع پر اپنے کامیاب تجربات طلبہ کے سامنے ذکر کرنا مناسب اور مفید ہوتا ہے۔ اس سے ان کا جذبہ بڑھتا اور فوری فائدہ ہوتا ہے۔

ان مساکین کو بھی نہ بھولیں

ہمارا معمول ہے کہ جب جامعہ میں کوئی نئی تعمیر شروع کرتے ہیں تو اس میں طلبہ کو بھی حسب توفیق حصہ ڈالنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں:

1) ان کے عطیات بہت بابرکت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ہم یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ دو شخص سب طلبہ کے سامنے جھولی پھیرتے ہیں۔ ہم ہر طالب علم کو کہتے ہیں وہ اس میں ہاتھ ڈالے۔ خواہ کوئی خالی ہاتھ ہی اس میں داخل کرلے۔ پھر جو کچھ حاصل ہوا سے عمارت میں

لگنے والے پیسوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

2) اس میں بچوں کی تربیت بھی ہے۔ ان کو خرچ کرنے کی عادت پڑے گی۔ اس لیے اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

ہمارے مدرسے میں جب ایک عمارت کی تعمیر شروع ہونے لگی تو میں نے گھر میں اپنی اہلیہ سے بات کی۔ انہوں نے اپنی والدہ مرحومہ کی طرف سے میراث میں ملنے والا سونے کا کڑا دے دیا۔ اس کی قیمت تقریباً 50 ہزار روپے تھی۔ اسی طرح پر گھر میں موجود بہوؤں نے بھی اپنی ایک ایک انگوٹھی مدرسے کے لیے دے دی۔

طلبہ کو ان کی قدر دلائیں

طلبہ کو یہ احساس دلائیں کہ آپ بہت قیمتی ہیں۔ ان کے فضائل بیان کریں۔ معاشرے میں ان کا کیا کردار ہے؟ اس کی اہمیت واضح کریں۔ آج کل طلبہ دنیا والوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے یا برادری والوں کے طعنوں کے باعث یا اسکول، کالج کے لڑکوں کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہوتے رہتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی ذات میں ہیرے جواہر ہیں۔ انہیں اپنی قدر نہیں۔ جو لوگ انہیں کمتر خیال کرتے ہیں، انہیں ان جواہر کی شناخت نہیں۔ اگر وہ پہچان لیں تو اپنے قول و عمل سے باز آجائیں۔

اسی پر ایک مختصر سا واقعہ سنیے۔ ایک استاذ نے طالب علم کو ایک مسئلہ بتایا۔ ساتھ ہی کہا: یہ مسئلہ پورے ایک لاکھ کا ہے۔ اس طالب علم نے اس بات کو حقیقت سمجھ کر اس پر یقین کر لیا۔ سادگی کا دور تھا۔ اسے ضرورت پڑی تو وہ جوتا سلانے کے لیے موچی کے پاس گیا۔ جب موچی سارا کام کر چکا تو طالب علم بیٹھ گیا۔ کہا: پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ تمہیں ایک لاکھ کی بات بتاتا ہوں۔ موچی نے کہا: بتاؤ! اس نے مسئلہ بتا دیا۔ موچی نے کہا یہ مسئلہ اپنے پاس رکھ۔ مجھے پیسے دے۔ طالب علم بہت پریشان ہوا۔ استاذ نے تو اس کی قیمت ایک لاکھ بتائی تھی۔ یہ اسے ایک آنے کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ موچی نے کہا: جوتا میرے پاس رہنے دے۔ جا کر پیسے لے آ۔ وہ حیران و پریشان

استاذ کے پاس پہنچا اور واقعہ بتایا۔ استاذ نے کہا تم نے اعتماد تو پورا کیا، مگر مطلب پورا نہیں سمجھا۔

اب استاذ نے طالب علم کو سمجھانے کے لیے ایک کام کیا۔ اسے ایک موتی دیا۔ کہا: فلاں سبزی والے کو یہ دے کر سبزی لے آؤ۔ جب سبزی فروش سبزی تول چکا تو طالب علم نے موتی آگے کر دیا۔ اس نے اٹھا کر مارا وہ موتی نالی میں جا گرا۔ طالب علم نے بڑی مشکل سے تلاش کیا اور استاذ کو سارا قصہ سنایا۔ استاذ نے کہا: اب فلاں جوہری کو دکھا کر قیمت پوچھ کر آؤ۔ جوہری نے جونہی موتی کو پکڑا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک نظر موتی کو دیکھتا تو دوسری بار طالب علم کو تکتا۔ اس نے پوچھا: سچ بتاؤ! یہ تم نے کہاں سے لیا؟ اس نے بتایا کہ استاذ محترم نے دیا ہے۔ جوہری نے کہا: تو بھی چور ہے، تیرا استاذ بھی چور ہے۔ فوراً پولیس کو بلوایا اور استاذ شاگرد حوالات پہنچ گئے۔

پولیس والے نے کہا: یہ ہیرا اتنا قیمتی ہے کہ سارے جوہری مل کر بھی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ یہ بادشاہِ وقت کے تاج کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا۔ اس پر استاذ نے وضاحت کی: دراصل فلاں بادشاہ میرے مہمان ہوئے تھے۔ وہ جاتے وقت ہدیہ دے کر گئے تھے۔ میرے نزدیک اس کی خاص وقعت نہیں۔ گھر میں پڑا تھا۔ طالب علم کو بات سمجھانے کے لیے جوہری کے پاس بھیجا تھا۔ تفتیش کی گئی تو استاذ محترم کی باتیں سچ ثابت ہوئی۔

جب سب اپنی جگہ آگئے تو اب استاذ نے کہا: جوہر کی قیمت جوہری ہی جان سکتا ہے۔ اس ہیرے کو جس پر پورا محکمہ حرکت میں آیا، سبزی فروش نے نالی میں پھینک دیا تھا۔ اس طرح موچی بھی مسئلے کی قیمت کو نہ جان سکا۔ بہر حال! دینی مدارس کے طلبہ ہیرے و جواہر بلکہ ان سے ہزار گنا بڑھ کر قیمتی ہیں۔ مگر ہمارا معاشرہ اس موچی اور سبزی فروش کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی قیمت نہیں سمجھتا۔

اِخراج کی نوبت کب آتی ہے؟

طالب علم گھر بار، والدین اور دنیا کی آسائشوں کی قربانی دے کر پڑھنے کے لیے آتا ہے۔

استاذ کو چاہیے کہ حتی الامکان اس کی تعلیم مکمل کروانے کی اور اسے کامیاب کرنے کی کوشش کرے۔ مختلف حیلوں حوالوں سے اس کے ساتھ چلے، لیکن اگر طالب علم بے حیا ہو جائے۔ ضوابط کی کوئی پروا نہ کرے۔ اساتذہ کی شفقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے تو بصورت مجبوری، توبہ استغفار کے اہتمام کے ساتھ اس کا اخراج کیا جا سکتا ہے۔

خام سے کندن بننے تک

بہترین مدرس فقط وہی بنتا ہے جس سے زمانہ طالب علمی میں ہی استاد خوب باریکی کے ساتھ سننے سنانے، غلطیاں نکالنے اور غلطیاں لگانے کی مشق کرواتا رہے۔ ان تمام معاملات میں غفلت اور بے توجہی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کی خوب سرزنش کرتا رہے۔

اکابر کے حالات سے آگاہی

اساتذہ کرام کو چاہیے کہ اکابر کے حالاتِ زندگی کا خوب مطالعہ کریں۔ دوران درس طلبہ کو اکابر علمائے دیوبند کے حالات زندگی سے آگاہ کریں۔ انہیں تعارف کروائیں۔ ان کے نقش قدم پر چلائیں۔ اکابر کے حالات پڑھنے کا ذوق طلبہ تو کجا اساتذہ کے اندر سے بھی نکل گیا ہے۔

☆☆☆

تربیت کے لیے چند آزمودہ نسخے

کس بچے کی تربیت کس طرح کی جائے؟ اس میں ہر استاد اور ہر منتظم کی ذاتی رائے، ذاتی تجربہ اور اپنا طریق کار ہی کارگر اور مفید ہوتا ہے۔ البتہ بعض طریقے عمومی طور پر طلبہ کی اکثریت کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں، چنانچہ طلبہ کی تربیت کے لیے چند ایسے آزمودہ نسخے ذکر کیے جا رہے ہیں جنہیں بروئے کار لا کر مثبت نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ باتیں گزشتہ صفحات میں ضمناً آ بھی چکی ہیں، تاہم موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہاں وضاحت وصراحت کے ساتھ بطور مشورہ کچھ مزید طریقے ذکر کیے جاتے ہیں:

۱) تعلیم کروانا اور کتابیں پڑھ کر سنانا:

ہمارے اکابر کی لکھی ہوئی بعض کتابیں ایسی ہیں جن کی مسلسل تعلیم طلبہ کے سامنے ہوتی رہے۔ خود استاد یا ان کی نگرانی میں کوئی طالب علم پڑھ کر سناتا رہے۔ وہ ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر عمل بھی کرتے ہیں اور یہ پڑھا ہوا یا سنا ہوا آئندہ زندگی میں انہیں کام بھی آتا رہتا ہے۔ اس تعلیم کا وقت کسی فرض نماز، مثلاً: عصر یا عشا کے بعد بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی چھٹی کے وقت کے آخر میں بھی کچھ منٹ اس کے لیے خاص کیے جا سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل چند کتابیں اس حوالے سے بہت نافع ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یا باری باری سب کتابیں طلبہ کو پڑھ کر سنائی جائیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اس کے ثمرات دیکھنے میں آئیں گے، مثلاً:

۱: فضائل اعمال
۲: علیکم بسنتی
۳: آداب المتعلمین
٤: آداب معاشرت
۵: مثالی شاگرد
٦: فضائل صدقات
۷: اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
۸: اکابر کا تقویٰ
۹: حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات
۱۰: آپ بیتی

۲) دعوت و تبلیغ کے اعمال میں شرکت کرنا:

بڑی عمر کے طلبہ کو ترغیب دے کر ان کے فارغ اوقات کو تبلیغی اعمال میں مصروف کیا جائے۔ تجربے میں یہ آیا ہے کہ جو طلبہ جمعرات کو شب جمعہ کے لیے جاتے ہیں، نیز تعطیلات میں سہ روزہ لگانے کا اہتمام کرتے ہیں، ان کی بڑی حد تک تربیت و اصلاح ان اعمال میں جڑنے سے ہی ہو جاتی ہے۔ فراغت کے بعد اسی قسم کے طلبہ مزید وقت بھی لگاتے ہیں، چلہ چار ماہ کے لیے نکلنا ان کے لیے دشوار نہیں ہوتا۔ ایسے حفاظ واپس آ کر شعبہ تحفیظ کے میدان میں بہترین انداز میں کام کرتے ہیں۔ ایسے مدرسین کی کارکردگی دوسروں کی بہ نسبت بہت بہتر ہوتی ہے۔

لہٰذا محترم اساتذہ کرام بڑی عمر کے طلبہ کی اچھی تربیت کے لیے مذکورہ ترتیب کو اپنا لیں تو ان شاء اللہ اس سے جہاں عوام الناس مستفید ہوں گے، وہیں طلبہ کی بحیثیت طالب علم اور

بحیثیت مدرس تربیت کا عمل بھی بخوبی انجام پائے گا۔

۳) سنت کے سانچے میں ڈھلی زندگی:

صبح سے لے کر شام اور رات سے لے کر صبح تک کا بیشتر وقت ایک مدرس کا اپنے طلبہ کے سامنے گزرتا ہے۔ کسی کے 12 تو کسی کی 20، 22 گھنٹے کی زندگی اپنے تلامذہ کے سامنے گزرتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر ایک مدرس کے یہ اوقات سنت کے مطابق گزرتے ہیں تو ان کی تاثیری قوت کسی بیان اور زبانی نصیحت سے کئی درجے بڑھ کر ہو گی۔

اس لیے کہ شاگرد لاشعوری طور اپنے استاد کے طور اطوار کو اپناتا چلا جاتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے جو اساتذہ اشراق، چاشت، تحیۃ المسجد اور بروقت سجدہ تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں، ایسے مدرس کے طلبہ ان اعمال کے خصوصی طور پر شوقین ہوتے ہیں۔

اسی طرح جو اساتذہ تقوی وطہارت، خشیت الٰہی اور معاملات کی صفائی کا اہتمام کرتے ہیں، اس کے اثرات ان کے تعلیمی نتائج اور شاگردوں کی زندگی پر واضح محسوس ہوتے ہیں، لہٰذا تربیت کے سلسلے میں استاد کا اپنا عمل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو صرف ایک مہینہ ہی آزمائشی طور اس نکتے پر عمل کر کے دیکھیں۔ آپ اس سے پہلے اور بعد کی حالت میں دھوپ چھاؤں جیسا فرق محسوس کریں گے۔

۴) صحبت صالح:

مدرسے کے اندر یا قرب وجوار میں کسی اللہ والے کی مجلس میسر ہو تو اس موقع کو غنیمت جاننا چاہیے۔ اس میں خود جانا اور بڑے طلبہ کو لے جاتے رہنا جانبین کی اصلاح میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

آخری گزارش

یہ چند باتیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

آخر میں آپ سب حضرات سے گزارش کروں گا کہ ہم میں سے ہر ایک کو خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ حتی الامکان قرآن کریم سے اپنا تعلق مضبوطی سے قائم رکھے۔ محبت اور شوق کے ساتھ قرآن پاک کو پڑھے۔ بلا ناغہ اس کی تلاوت کرے۔ اپنی اولاد کو قرآن پاک پڑھنے کا اہتمام کرے، خصوصاً اہل علم حضرات سے اور قرآن پڑھانے والے قرائے کرام سے گزارش ہے کہ وہ قرآن پاک پڑھانے کو اپنی سعادت سمجھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ یا اللہ! ہمیں زندگی کے آخری سانس تک خدمتِ قرآن کی توفیق عطا فرما۔ ہمارا پڑھنا پڑھانا قبول فرما۔ اور بھرپور دیانتداری کے ساتھ، استغنا کے ساتھ، نیکی اور تقویٰ کے اہتمام کے ساتھ اپنی تمام تر توانائیاں قرآن کی خدمت میں صرف کردیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ضرور آپ کو دنیا میں عزت اور آخرت میں اعزاز سے نوازے گا۔ ان شاء اللہ!

ان گزارشات میں سے کوئی بات مزاج کو ناگوار گزری ہو تو میں اس پر معذرت چاہتا ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ انیب

واخردعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین

محمد یاسین

11-04-2011

ضمیمہ جات

- ...... تربیتی مذاکرے
- ...... حضرت قاری صاحب سے کیے گئے انٹرویوز

ضمیمہ 1.

تربیتی ''مذاکرے''

طلبہ کی تربیت کے حوالے سے بہت ہی نافع اور زود اثر ایک عمل روزانہ کا مذاکرہ بھی ہے۔یعنی ہر روز اپنے طلبہ کو کوئی دینی بات سمجھانا، مثلاً: ایک دن یہ بیان کریں کہ وضو کس طرح کیا جائے؟ دوسرے دن نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ اور کسی دن کھانے کے آداب، وغیرہ پر بات کی جائے۔صرف 15 یا 20 منٹ طلبہ کے سامنے کسی موضوع پر مذاکرہ کیا جائے تو انہیں قدم قدم پر رہنمائی میسر آتی رہے گی۔یہ مذاکرہ ہر روز کسی نئے موضوع پر ہونا چاہیے۔موضوع پر گفتگو سے پہلے بھر پور تیاری کرنی چاہیے۔موضوعات کا انتخاب اس انداز سے کیا جائے کہ طلبہ کی عمر، ذہن اور ضرورت کا اس میں بھر پور خیال کیا گیا ہو۔

موضوعات کے لیے چند عنوانات قائم کر کے اس کے مختلف پہلو ذکر کیے گئے ہیں۔آپ اپنی صوابدید سے انہیں روزانہ یا ہفتہ واری مذاکرے کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔ ہر موضوع پر گفتگو سے پہلے مطالعہ فرمائیں۔تاکہ ننھے دماغوں میں مستند بات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو سکے۔

اساتذہ کرام کی سہولت کے لیے یہاں نمونے کے دو مذاکرے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔انہیں اسی ترتیب کے مطابق ہر روز ایک موضوع پر مذاکرہ یعنی طلبہ کے سامنے وعظ کرنے کی ترتیب بنالی جائے۔ مذاکرے کا وقت کوئی بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ 12 بجے کے قریب جو عام طور پڑھائی موقوف کرنے کا وقت ہوتا ہے۔یا عشا کے بعد یا اپنے ماحول کے لحاظ سے جو بھی مناسب سمجھیں، ترتیب بنالیں۔

☆

نمونے کے دو مذاکرے

۱- عظیم خزانہ

(نماز تہجد)

الحمدللّٰہ وحدہ ، والصلاۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ ، أما بعد!

عزیز طلبہ! آج میں آپ کے سامنے ایک انتہائی قیمتی نماز کا ذکر کروں گا۔ یہ نماز ہے تو نفلی مگر دین و دنیا کی بھلائی کا ایک عظیم خزانہ ہے۔ اس میں ذرا سی مشقت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بارش کی طرح انسان پر برسنے لگتی ہے۔ وہ نماز ''نمازِ تہجد'' ہے۔

نمازِ تہجد اس قدر اہم ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم فرمایا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی۔ اگر چہ امت پر فرض نہیں کی گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ، عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا. [بنی اسرائیل:79]

''اور (اے پیغمبر!) رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو۔ جو تمہارے لیے ایک اضافی عبادت ہے۔ امید ہے تمہارا پروردگار تمہیں مقامِ محمود تک پہنچائے گا۔''

اس سے پتا چلا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تہجد پڑھنے پر آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام (شفاعتِ کبریٰ) عطا ہو رہا ہے۔ جو کسی اور نبی کو بھی نہ دیا جائے گا۔ ہم لوگ اگر تھوڑی سی مشقت برداشت کریں تو اللہ ہمیں بھی وہ چیز عطا فرمائیں گے جو خاص ہمارے لیے ہوگی۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔" [الذاریات:18]

"اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ سحری کے وقت اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

اللہ کو یہ عمل بہت ہی پسند ہے۔ اسی لیے تو اسے اپنے خاص بندوں کی علامت قرار دیا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ وقت اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا ہے۔ اس وقت جب سب لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ آدمی اللہ سے چپکے چپکے مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس کی ہر دعا قبول کرتے ہیں۔

استاد: "آپ لوگ سمجھ رہے ہیں نا؟"

طلبہ: "جی استاد محترم!"

بہر حال! جو لوگ تہجد کا اہتمام کرتے ہیں ان کو ایک روحانی لذت نصیب ہوتی ہے۔ ایک بڑے امام "امام ابن المنکدر" رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"دنیا میں صرف تین مزے رہ گئے ہیں: ایک، رات کی عبادت۔ دوسرا، باجماعت نماز ادا کرنا۔ اور تیسرا، بھائیوں سے ملاقات کرنا۔" (نماز مسنون از صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ:579)

اگر ہم بھی استقامت کے ساتھ مسلسل اللہ کی کوئی بھی عبادت بالخصوص تہجد ادا کرتے رہیں گے تو ہمارے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ بھی مشکل نہ رہے گا، بلکہ شوق اور رغبت بڑھے گی، مزا آئے گا۔

استاد: "کیوں بھئی! آپ عمل کی پوری کوشش کریں گے نا؟"

طلبہ: "ان شاء اللہ!!!"

استاد: "ماشاء اللہ! اللہ قبول فرمائے۔ آسان فرمائے۔"

دیکھیں! اللہ کی نعمتیں ہم دن رات کھاتے ہیں۔ یہ صحت، فراغت، بے فکری، حفظ قرآن، مدرسہ، اساتذہ۔ سب اللہ نے ہمیں عطا فرمایا۔ اب اس کی خاطر ہمیں چاہیے کہ اپنے جسم کو تھکا دیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ معمول سے زیادہ کھا لیتے تو تمام رات قیام فرماتے، نفلوں میں کھڑے رہتے۔ ساتھ فرماتے: جب گدھے کو چارہ زیادہ کھلایا جاتا ہے تو اس سے کام بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔ (نماز مسنون: صوفی عبدالحمید سواتی: 570)

پیارے بچو! ہمارا تعلق تو قرآن پاک سے ہے۔ قرآن اور تہجد کا خصوصی تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ [بنی اسرائیل: 78]

(اے پیغمبر!) سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کرو، اور فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا اہتمام کرو۔" (آسان ترجمہ قرآن: 616)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت میں تلاوت کا حکم دیا ہے۔

ایک حدیث پاک آپ کو سناتا ہوں۔ یہ مبارک حدیث، احادیث کی سب سے عظیم کتاب "بخاری شریف" میں لکھی ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے مکان میں تہجد کی نماز ادا فرما رہے تھے۔ ساتھ ہی مسجد میں حضرت عباد رضی اللہ عنہ نماز تہجد پڑھتے ہوئے تلاوت فرما رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا۔ کیا یہ عباد ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! یا رسول اللہ۔ یہ سن کر آپ علیہ السلام نے فرمایا: "رَحِمَ اللّٰهُ عَبَّادًا" اللہ عباد پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ (بخاری شریف: 940/2)

دیکھیں! اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد میں قرآن پاک پڑھنے والے کو خوش ہو کر دعا دی ہے۔ اگر ہم بھی تہجد پڑھیں گے اور اس میں اپنی منزل دہرائیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ہمیں بھی ملے گی۔

استاد: "سب بچے غور سے سن رہے ہیں نا؟ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ کون بتائے گا؟"

طلبہ: "ہم سب تیار ہیں استاد جی!"

استاد: ''عبداللہ تم کھڑے ہو جاؤ۔ عبداللہ آپ بتانا شروع کریں۔ محمد! کہیں یہ بھولنے لگیں تو آپ بتاؤ گے۔''

عبداللہ: ''استاد جی! آپ نے مذاکرے میں ہمیں تہجد کے بارے میں وعظ فرمایا ہے۔ جس میں آپ نے تین آیات مبارکہ اور دو واقعات ارشاد فرمائے ہیں۔''

محمد: ''ایک حدیث پاک بھی تو ہم نے سنی ہے نا!''

عبداللہ: ''استاد مکرم! ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم تہجد کی نماز ادا کیا کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ اس وقت سب دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ تہجد میں تلاوت کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ملتی ہے۔ مسلسل پڑھتے رہنے سے خوشی اور سرور ملتا ہے۔ اور......''

عبدالرحمٰن: ''استاد جی! ہم ان باتوں پر کیسے عمل کر سکتے ہیں؟''

بہت خوب! میں یہ بات بتانے ہی والا تھا۔ تہجد کی اتنی بڑی فضیلت حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی۔ صبح عام نظم سے تھوڑی دیر پہلے جاگنا پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے جلدی جاگنے کے لیے وقت پر سونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے آپ رات کی چھٹی ہونے کے بعد جلدی سو جایا کریں۔ اللہ سے دعا کر کے سوئیں۔ صبح ان شاء اللہ آپ کی آنکھ کھل جائے گی۔ پھر دو رکعت یا جس قدر ہو سکے ادا کریں۔ اگر کسی کے لیے صبح اٹھنا بہت مشکل ہو تو وہ رات کو ہی کچھ نوافل تہجد کی نیت سے پڑھ کر سو جایا کرے۔ اس سے بھی ان شاء اللہ پورا اجر ملے گا۔ لیکن آہستہ آہستہ صبح اٹھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

استاد: ''سب اس کی کوشش کریں گے نا ان شاء اللہ؟''

طلبہ: ''(بلند آواز سے) ان شاء اللہ ہم آج رات سے ہی کوشش کریں گے۔''

سبحانك اللّٰهم أشهد ان لا اله الا أنت استغفرك و أتوب اليك

۲- دنیاو آخرت کی کامیابی کی ضمانت

(تین نمازیں: اشراق، چاشت، اوابین)

الحمدللہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

عزیز طلبہ کرام! آج کی نشست میں آپ کے سامنے دن کی نفلی نمازوں کا کچھ تذکرہ کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے پانچ فرض نمازیں ادا کرنا تو ہر حال میں لازم ہوتی ہیں۔ ادا کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ہمیں کچھ مخصوص نفلی نمازیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ ان کے بے شمار فوائد ہیں۔ کچھ فوائد دنیوی ہیں اور کچھ اخروی۔ بہر حال! ان اعمال میں مشقت بہت تھوڑی سی اور اجر و ثواب بے انتہا ہے۔ یہ تین نفل نمازیں اشراق، چاشت اور اوابین ہیں۔

استاد: ”سب طلبہ میرے ساتھ مل کر ان کے نام دہرائیں۔“

طلبہ: ”اشراق، چاشت، اور اوابین۔“

ان نمازوں میں سے ہر ایک کے بارے میں 3،3 باتیں بتاؤں گا۔ ان کا تعارف، فضیلت اور طریقہ۔ تمام طلبہ ساتھ ساتھ ذہن نشین کرتے جائیں۔

سب سے پہلے اشراق کی نماز ہے اور اشراق کا معنی ہے: روشن کرنا۔ اس کا وقت سورج نکلنے کے بعد جب اس کی دھوپ پیلی نہ رہے، بالکل صاف ہو جائے، شروع ہوتا ہے۔ یعنی سورج نکلنے کے تقریباً 15 منٹ بعد۔ اس کا نام اشراق اس لیے ہے کہ یہ نماز دن کے خوب روشن ہو جانے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس کی دو یا چار رکعت پڑھی جاتی ہیں۔

ان دو یا چار رکعتوں کا ثواب بہت بڑا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ.... جنہوں نے بچپن

میں دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی.... فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے صبح کی نماز باجماعت پڑھی۔ پھر وہیں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج طلوع ہوا۔ پھر اس نے دو رکعت نماز اشراق ادا کی۔ تو اسے ایک حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شک دور کرنے کے لیے تین بار ارشاد فرمایا: پورے حج وعمرہ کا۔ پورے حج وعمرہ کا۔ پورے حج وعمرہ کا۔" (الترغیب والترہیب: 164/1)

طلبہ اور اساتذہ جنہوں نے نماز فجر کے بعد طلب علم (تعلیم وتعلم) میں مصروف ہونا ہے۔ یہ حضرات اگر فجر کے بعد اسی جگہ بیٹھنے کے بجائے سیر، ورزش وغیرہ کریں اور بروقت درسگاہ میں حاضر ہونے کے لیے ضروری تیاری کریں تو ان شاء اللہ ان کے اجر میں کمی نہیں ہوگی، بلکہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات سے امید ہے کہ بیٹھنے والوں سے بھی زیادہ اجر ملے گا۔ حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر کا یہی معمول تھا۔

طلبہ: "سبحان اللہ!"

استاد: "اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔"

اسی طرح ایک اور حدیث پاک ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب فجر پڑھ لیتے تو اپنی نماز کی جگہ پر تشریف رکھتے۔ جب سورج اچھی طرح نکل آتا تو پھر نماز (اشراق) ادا فرماتے۔ (صحیح مسلم: 234/1)

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا معمول بتلا دیا۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اجر وثواب کے محتاج ہیں۔ ہمیں بھی اسی طرح عبادت کا حریص ہونا چاہیے۔

اس کا اصل طریقہ تو یہی ہے کہ اپنی جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے ذکر، درود شریف یا استغفار کرتے رہیں۔ جب وقت ہو جائے تو نماز اشراق ادا کر لی جائے۔ لیکن آپ اپنے وقت کے مطابق درس گاہ میں آ کر اپنی پڑھائی شروع کر لیں۔ یہاں جو کچھ آپ تلاوت کریں گے۔ سبق

پڑھیں گے، اس کا ثواب تسبیح پڑھنے سے بھی زیادہ ہوگا۔ پھر جب ناشتے وغیرہ کے لیے باہر نکلیں تو نماز اشراق بھی ادا کرلیں۔ اگر درس گاہ شروع ہونے سے پہلے اشراق کا وقت ہو چکا تو 2 یا 4 رکعت پڑھ کر درس گاہ میں آئیں۔

دوسری نفلی نماز چاشت ہے۔ اسے صلوٰۃ الضحیٰ بھی کہتے ہیں۔ اس کی کم سے کم 2 رکعت اور زیادہ سے زیادہ 12 رکعت ہیں۔ یہ 9 بجے کے قریب ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بے شمار فضائل اور فوائد ہیں۔ اسی طرح یہ نماز انسان کے تمام اعضا کا صدقہ ہے۔ اس سے ہر ہر جوڑ کا شکر ادا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر آدمی پر اپنے ہر جوڑ کا صدقہ دینا لازم ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ یہ صدقہ ادا کرے۔ لیکن وہ صدقہ اللہ کے ذکر سے ادا کرے۔ اس طرح کہ ایک بار سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ ایک بار الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ کسی کو نیکی کی تلقین کرنا صدقہ ہے۔ کسی کو برے کام سے روک لینا صدقہ ہے۔ لیکن اگر ہر ہر جوڑ کا الگ الگ صدقہ ادا کرنے کے بجائے چاشت کی دو رکعت پڑھ لے گا تو اس کے پورے جسم کا صدقہ ادا ہو جائے گا۔ (صحیح مسلم: 15/2)

استاد: ''کیا خیال ہے، ہے نا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی انتہا؟''

طلبہ: ''بے شک!!!''

ہم کتنی غفلت کرتے ہیں! فرض نمازوں کے ساتھ مستقل نوافل ہم ادا نہیں کرتے۔ فرائض میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کا وبال تو اپنی جگہ ہے ہی، خود سوچیں ہم کتنے بڑے اجر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جب ایک عام نفل نماز کے اجر کا یہ حال ہے تو فرائض، واجبات اور ان کے نوافل کے اجر کا کیا حال ہوگا!؟

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: اگر میرے ماں باپ میرے لیے زندہ کر دیے جائیں تو بھی میں اس نماز کو نہ چھوڑوں گی۔ (موطا امام مالک: 136)

عبدالرحمٰن: ''استادِ محترم! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی بات سمجھ نہیں آئی۔''

استاد: ''شاباش! کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بت بن کے بیٹھے نہ رہنا چاہیے۔ فوراً پوچھ لینا چاہیے جیسے عبدالرحمٰن نے کیا۔''

مطلب یہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے میرے والدین کو زندہ کردیں۔ پھر مجھے کہا جائے کہ آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہے۔ اس میں چاہو تو والدین سے مل لو۔ چاہو تو چاشت کی دو رکعتیں پڑھ لو۔ تو میں دوبارہ زندہ ہو کر آئے ہوئے والدین کی زیارت قربان کردوں گی، مگر چاشت کی یہ دو رکعتیں نہ چھوڑوں گی۔ آپ خود سوچیں! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد سب سے افضل انسان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، جبکہ والدہ تھی ام رومان، خلیفۃ المسلمین کی بیوی۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمارہی ہیں کہ میرے نزدیک ایسے عظیم الشان والدین کی ملاقات چھوڑ دینا آسان ہے، مگر چاشت مجھے ان سے زیادہ محبوب ہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ والدین کو دنیاوی محبت کی وجہ سے ملنا ہوتا ہے، جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے ملاقات نصیب ہورہی ہے، لہٰذا میں والدین کے بجائے اللہ سے ملاقات کرنا چاہوں گی۔ ظاہر ہے ان سے زیادہ دنیا پر دین کو ترجیح دینے والا کون ہوسکتا ہے؟

استاد: ''اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ شوق اور اہمیت نصیب فرمائے۔''

طلبہ: ''آمین، یارب العٰلمین۔''

جب پڑھائی کا وقفہ ہو، اسے ادا کرلینا چاہیے۔ زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا۔

مگر یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کی اپنی تعلیم، درسگاہ اور سبق کی پابندی یہ تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے۔ اس لیے ان عبادات کو چھٹی کے اور تعطیلات میں تو ہم خوب ادا کریں۔ یہ اجر اور فوائد لوٹیں، مگر دوران پڑھائی جب اور جتنا موقع ہو، اس سے فائدہ اٹھائیں۔

استاد: ''اگر آپ یہ بات سمجھ چکے ہیں تو میں آپ کو تیسری اہم نماز کا تعارف کرواؤں؟''

طلبہ: ''جی استاد جی! ہم سب پُرشوق ہیں۔''

استاد: ''تیسری نماز کا نام کیا بتایا تھا؟''

نافع: ''اوابین''

جی ہاں! اوابین بھی نیکیوں کا خزانہ ہے۔ یہ مغرب کی نماز کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اس کی چھ یا بیس رکعات ہیں۔ بات کو مختصر کرتا ہوں۔ اس کی فضیلت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے مغرب کے بعد چھ رکعات نماز پڑھی۔ ان کے درمیان اس نے کوئی بری بات زبان سے نہیں نکالی تو اس کو 12 سال کی عبادت کا ثواب ملے گا۔

سبحان اللہ! کتنی تھوڑی کوشش پر کتنا عظیم اجر! ہماری عمر زیادہ ہو نہ ہو مگر ہم ہر روز یہ چھ رکعت ادا کر کے صرف ایک ہفتے میں 42 سال کی عبادت کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم طلبہ کے لیے اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مغرب کے بعد کی دو سنت موکدہ کے بعد نماز والے دو نفلوں میں اوابین کی بھی نیت کر لیں۔ پھر ساتھ دو نفل مزید ملا لیں، اس طرح ہماری معمول کی رکعتوں کے ساتھ ساتھ پورے اوابین بھی ادا ہو جائیں گے۔

یہ اللہ تعالیٰ شانہ کا مزید فضل ہوا کہ ایک نماز میں جتنی نیتیں کرتے چلے جائیں، اتنا ہی ثواب بڑھتا چلا جائے گا۔

استاد: ''کیا یہ عبادات، نوافل کچھ مشکل ہیں؟''

طلبہ: ''بالکل نہیں۔''

استاد: آج ہی ان پر عمل شروع کریں۔ کل میں پوچھوں گا۔ جس نے سارے نوافل ادا کیے، پڑھائی کا حرج کیے بغیر، اسے انعام دیا جائے گا۔

طلبہ: ''ہم ضرور کوشش کریں گے۔''

سبحانك اللهم وبحمدكِ أشهد أن لا اله الا أنت استغفرك وأتوب اليك

☆☆☆

موضوعات برائے مذاکرہ کا پس منظر

یہ 1993ء کی بات ہے۔ تب ناچیز (محمد حسین) باغ والی مسجد، ماڈل ٹاؤن سی میں حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی درسگاہ میں پڑھ رہا تھا۔ بڑا بابرکت زمانہ تھا۔ کبھی کبھی حضرت اقدس حضرت قاری صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ضربِ تادیبی کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں ایک قاری صاحب تھے جو باغ والی مسجد میں مدرس بھی تھے اور اس کے علاوہ حضرت کے حکم سے شعبہ حفظ کے ذمہ دار بھی تھے۔ وہ قاری صاحب روزانہ عشا کی نماز کے بعد تمام طلبہ کو مسجد کے صحن کے سامنے والے بڑے ہال میں جمع کر کے مذاکرہ کرتے تھے۔ ہر روز ایک نئے موضوع پر بات کرتے تھے۔ ہر موضوع پر بہت مفید اور کارآمد باتیں بتائی جاتیں۔ ان باتوں سے ہمیں بہت فائدہ محسوس ہوتا۔ بڑی محبت اور شوق سے سنتے تھے۔ تھا تو بچپن اور ساتھ میں طالب علمانہ غفلت بھی، بایں ہمہ یہ شوق چرایا کہ آخر یہ روز نت نیا موضوع کہاں سے لے آتے ہیں؟

ایک دن جسارت کو ذرا ہمت کر کے میں نے ان کے کمرہ میں جا کر عرض کی کہ حضرت! آپ کا یہ یومیہ مذاکرہ بہت مفید ہوتا ہے۔ اس وقت میں پوری توجہ سے سنتا ہوں، مگر ایک، دو دن کے بعد گزشتہ بات بھول جاتی ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ لکھا ہوا ہو تو میں فوٹو کاپی کروانا چاہتا ہوں، تاکہ یاد بھی کرتا رہوں اور آئندہ زندگی میں بھی کام آئے۔ قاری صاحب نے نظر بھر کر دیکھا اور فرمایا کہ کل میری درس گاہ میں میرے پاس آنا۔ اگلے دن حاضر ہوا تو فرمایا کہ یہ بات آپ کے ذہن میں خود آئی ہے یا کسی نے کہا ہے۔ بندہ نے جیب سے ایک پھٹا ہوا کاغذ نکال کر دکھایا کہ حضرت کچھ دن تو میں تھوڑا تھوڑا لکھتا رہا ہوں۔ مگر پھر مکمل نہیں لکھ سکا۔ بس میرا شوق ہے، کہا تو کسی نے نہیں۔ پوچھا: اسکول کتنا پڑھے ہو؟ جواب تھا کہ حفظ کے ساتھ پرائمری

پاس کیا ہے۔ پھر انہوں نے ڈیسک کی دراز سے 4 صفحات نکال کر دیے کہ اس کی کاپی کرالو اور اصل احتیاط سے واپس لے آنا۔

اس طرح ان موضوعات کی فہرست مجھے حاصل ہوگئی۔ وہ 4 صفحات میں نے گھر میں محفوظ کر کے رکھ دیے۔ پھر یہ محفوظ صفحات گھر میں ہی گم ہو گئے اور بھول گئے۔ جب چند سال قبل تدریس شروع کی۔ طلبہ کو چند دن تک کچھ باتیں سمجھائیں۔ پھر باتیں ختم ہو گئیں تو اب وہ گمشدہ صفحات یاد آنے لگے۔ تلاش بسیار کے بعد بالآخر گرد آلود چند صفحات گولائی میں مڑے ہوئے اچانک مل گئے۔ آج انہی موضوعات کو کچھ اضافے اور نئی ترتیب کے ہمراہ حضرات مدرسین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اس بھولے پن میں یہ بات حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ یہ چار صفحات آگے چل کر حضرت قاری صاحب کی اس مایہ ناز کتاب کا حصہ بنیں گے، مگر مذکورہ قاری صاحب کا نظریں بھر کر دیکھنے کا منظر آج بھی میرے سامنے ہے۔ اس وقت قاری صاحب کو اس مہربانی کے بدلے میں فقط جزاک اللہ کہا، مگر آج میرے لیے ان کی وہ مہربانی احسان عظیم ہے جس کے لیے دل شکر گزار اور زبان دعا گو ہے۔

یہ فہرستِ مضامین پا کر اندازہ ہوا کہ واقعی یہ جو کہا جاتا ہے: ''Old is gold'' ''یعنی'' پرانی چیز سونا ہوتی ہے۔'' ایک بہت بڑا سچ ہے۔ یومیہ مختلف موضوعات پر مذاکرہ طالب کی انگلی پکڑ کر چلانے کے مترادف ہوگا۔ طلبہ کو اچھے انداز میں سمجھانے کے لیے اساتذہ کن کتابوں کا مطالعہ کریں گے؟ اس کا کچھ تذکرہ پچھلے ابواب میں آچکا ہے۔

ان کتب کے علاوہ حضرات مشائخ کے چھپے ہوئے مواعظ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے ''اصلاحی خطبات''، حضرت حکیم مولانا شاہ محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ، حضرت پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم کے ''خطباتِ فقیر'' نیز حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی دامت برکاتہم کے ''اصلاحی بیانات'' بہت سہل، مدلل اور تقریباً ہر موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔

اس کا ان شاء اللہ بے حد فائدہ ہوگا۔ کم از کم اس مرتب ناچیز کے حفظ سے شعبہ کتب کی طرف رخ کرنے میں میرے استاذ محترم قاری شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم (جو عرصہ 20 سال سے جامعہ دارالقرآن، فیصل آباد میں شعبہ حفظ میں مدرس ہیں) کے یومیہ مذاکرے میں دی گئی ترغیب وتحریض کا بڑا دخل ہے۔

☆☆☆

فہرستِ موضوعات وعنوانات

طہارت

١- وضو کی فضیلت اور عملی طریقہ ٢- غسل کا مسنون طریقہ، فرائض وغیرہ
٣- جسم کے پوشیدہ حصوں کے بال صاف کرنا (بالغ طلبہ کے لیے)
٤- ڈاڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کی شرعی تفصیل
٥- ناخن کاٹنے کی تاکید (ایک خاص وقفے کے بعد چیک بھی کرنے چاہییں)

نماز

١- نماز باجماعت کے فضائل ٢- نماز کے ضروری مسائل
٣- نماز پڑھنے کی عملی مشق کروانا ٤- امامت کے مسائل اور عملی مشق
٥- اذان واقامت، خطبہ جمعہ یاد کروانا، نیز عملی طور پر اذان دلوانا، اقامت کہلوانا
٦- دن بھر کی نفل نمازیں (تہجد اشراق، چاشت، سنن زوال، اوابین، صلوٰۃ الحاجات، نماز توبہ، نماز شکر، صلوۃ التسبیح کا طریقہ، استخارہ وغیرہ کی فضیلت بتانا اور تلقین کرنا)
٧- جمعہ کے دن کے مسنون اعمال بتلانا، تلقین کرنا اور پوچھنا
٨- نماز جنازہ کا طریقہ بتانا اور نماز جنازہ پڑھنے اور پڑھانے کی عملی مشق کروانا
٩- ہر نماز کے بعد کی مسنون سورتیں، فضیلت

روزہ، عیدین، زکاۃ

۱- رمضان کی فضیلت، روزوں کی فضیلت
۲- روزے کے بنیادی مسائل
۳- تراویح کے ضروری مسائل
٤- اعتکاف کی فضیلت، ترغیب

تلاوتِ قرآن پاک

۱- حافظ قرآن بننے کی فضیلت
۲- سبعہ عشرہ قاری بننے کی فضیلت
۳- تلاوت قرآن پاک کی فضیلت
٤- تلاوت کے آداب
۵- ایصال ثواب کی اہمیت
٦- خاص سورتوں کی فضائل وفوائد
۷- مروجہ قرآن خوانی کی شرعی حیثیت
۸- مجمع میں تلاوت کی خصوصی تربیت
۹- نعت یاد کروانا، نعت پڑھنے کی خصوصی مشق کروانا

عیوب کی مذمت

۱- کافروں کی نقالی کی مذمت، ان کے طور اطوار سے نفرت دلانا اور اس سے بچنے کی تلقین
۲- گناہ کبیرہ کی مذمت اور ان کی فہرست بتانا
۳- جھوٹ کی مذمت
٤- حسد کی مذمت
۵- چغل خوری کی مذمت
٦- کینہ پروری کی مذمت
۷- غصہ کرنے کی مذمت
۸- غیبت کی مذمت
۹- امانت میں خیانت کی مذمت
۱۰- بدعت کی تفصیل اور اس کی مذمت
۱۱- رسومات کی مذمت
۱۲- ریاکاری کی مذمت
۱۳- لڑائی جھگڑا کرنے کے نقصانات
١٤- بدنظری کی حرمت اور اس کے نقصانات

۱۵- حرام کمانے، کھانے اور کھلانے کی مذمت، نقصانات

۱۶- مشکوک مال سے اجتناب کرنا

۱۷- غیر محارم کی تفصیل اور بے پردگی پر تنبیہ

۱۸- فضول خرچی کی مذمت

۱۹- استاد، مدرسہ اور کتابوں کی بے ادبی کا وبال

۲۰- ٹی وی، وی سی آر دیکھنے کے نقصانات

۲۱- تراویح پڑھانے پر مٹھائی اور رقم لینے کی مذمت

۲۲- غلط دوستی اور غیر ضروری تعلقات کے نقصانات

۲۳- دوسروں کی چیزیں بغیر اجازت اٹھانا، استعمال کرنا، چُرانا

خوبیوں کی ترغیب

۱- عالم بننے کی ترغیب...... ۲- دینی غیرت پیدا کرنے کے لیے واقعات سنانا......

۳- تبلیغ دین کے لیے نکلنا...... ٤- دین کے لیے مالی وجانی قربانی......

۵- خدمت کی فضیلت ...... ٦- اساتذہ کی خدمت ...... ۷- ملک وقوم کی خدمت

...... ۸- والدین کی خدمت......

۹- اللہ کی مخلوق کی خدمت...... ۱۰- سچ بولنا، کم بولنا......

۱۱- حیا اور پاک دامنی...... ۱۲- بے داغ جوانی......

۱۳- درسگاہ میں پابندی کی ترغیب (واقعات) ...... ۱٤- صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک......

۱۵- اچھے اخلاق کی فضیلت اور نشاندہی ...... ۱٦- صبر کی فضیلت...... ۱۷- شکر کی فضیلت...... ۱۸- دیانت وامانت کا خیال رکھنا...

۱۹- صلح اور معاف کردینے کی فضیلت

آدابِ معاشرت

۱- حقوق اللہ کی اہمیت ۲- حقوق العباد کی اہمیت
۳- صاف ستھرا لباس پہننا ٤- مہمان نوازی کی فضیلت و آداب
۵- سونے کے آداب ٦- کھانے کے آداب
۷- مریض کی عیادت ۸- اپنے ظاہر کو سنت کے سانچے میں ڈالنا
۹- ٹوپی پگڑی کا زندگی بھر ہر حال میں اہتمام
۱۰- اسلامی تہذیب و معاشرت کا مطلب، اہمیت، فضیلت، فوائد
۱۱- خوشبو لگانے کے مسنون مواقع

دعائیں، اذکار

۱-درود پاک کے فضائل و فوائد ۲- دن بھر کی تسبیحات
۳-مسنون دعائیں، فضیلت بتانا، یاد کروانا
٤- اصلاحی تعلق کی اہمیت، ترغیب، رہنمائی
۵- تقویٰ کا اہتمام، فضائل، حصول کے طریقے

متفرق موضوعات

۱- آخرت کا تذکرہ ۲- جنت کا شوق پیدا کرنا
۳- دوزخ کا خوف دلانا ٤- عذاب قبر کا تذکرہ
۵- انبیائے کرام علیہم السلام کا مفصل تذکرہ (اس میں ہر نبی کا تذکرہ مستقل موضوع ہے)
٦- اکابر دیوبند کا تذکرہ (یہ بھی کئی موضوعات کو جامع ہے)

۷- مذہب اسلام کی خوبیاں

۸- معاصر علما و مشائخ کی عقیدت دل میں بٹھانا، ان کی زیارت کرنے اور دعائیں لینے کی ترغیب دینا۔ (پاکستان بھر کے بالخصوص اور دیگر ممالک کے علما و مشائخ کا تعارف بھی کروائیں)

۹- مسئلہ ختم نبوت، وضاحت اور ملکی قانون

۱۰- ملک کی سلامتی کی فکر دلانا، محبت پیدا کرنا

۱۱- اپنی مادر علمی، اساتذہ اور ساتھیوں کا تذکرہ

۱۲- اپنے کامیاب اور ناکام تجربات بتانا

۱۳- امتحان کی تیاری کا طریقہ ۱۴- امتحان دینے کا طریقہ

۱۵- چھٹیاں گزارنے کی ہدایات

۱۶- گاؤں کے اور قریبی مسجد کے امام کا ادب کرنا

۱۷- چلتے پھرتے قرآن پڑھتے رہنا

۱۸- ہر سال بلاناغہ مصلی سنانے کی ترغیب

۱۹- فراغت کے بعد اساتذہ سے ملتے رہنا

۲۰- ادارے کے ہر استاد، حتی کہ ادنی ملازم تک کا ادب کرنا

۲۱- عملی اور کاروباری زندگی میں بھی دینداری کا اہتمام کرنا

۲۲- منتخب اچھی کتب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب اور ان کی نشاندہی

۲۳- حفظ کیا ہوا قرآن یاد رکھنا فرض ہے اور بھلا دینا حرام ہے

ایک نہایت اہم موضوع:

''بڑے ہو کر کیا بنو گے؟'' اس سوال کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی سے متعلق بچوں سے پوچھنا، دین اور دنیا کے مختلف میدانوں سے متعارف کروانا۔

ضمیمہ۔2

''انٹرویوز'' کا تعارف و پس منظر

نمونہ اسلاف حضرت اقدس حضرت مولانا قاری یاسین صاحب دامت برکاتہم کے چشمہ فیض سے ایک امت سیراب ہو رہی ہے۔ آپ کے فکر و فن کے کچھ گوشے گزشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ کیے۔ آخر میں ایک خاصے کی چیز پیش خدمت کی جا رہی ہے۔ سن دو ہزار اٹھارہ اور سن دو ہزار بائیس میں دو معزز صحافی حضرات نے حضرت والا دامت برکاتہم سے بہت تفصیلی انٹرویوز کیے، جن میں حضرت نے پورے شرح صدر کے ساتھ مفصل جوابات عنایت فرمائے۔ ان حضرات میں سے پہلے محترم و مکرم جناب انور غازی صاحب ہیں، جنہوں نے ''درسِ قرآن ڈاٹ کام'' کے لیے انٹرویو کیا، جبکہ دوسرے عزیز برادر جناب مولانا محمد عبدالودود صاحب ہیں، جنہوں نے ''جے ٹی آر میڈیا ہاؤس'' کے لیے گفتگو ریکارڈ کی۔ ان انٹرویوز کو ضبط و ترتیب سے گزار کر بطور ضمیمہ من و عن کتاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ بقیہ کتاب کی طرح اس حصے کو بھی حضرت دامت برکاتہم نے خود ملاحظہ فرما کر تصحیح و تصدیق فرما دی ہے۔ انٹرویوز کے سوال و جواب میں معلومات کا نیا ذخیرہ سامنے آیا ہے۔ ان میں خاص طور پر حضرت کے ابتدائی تعلیم کے احوال، بڑوں کی شفقتیں اور تربیت کے واقعات، طالبات کا مدرسہ کیسے چلایا جائے؟ بھولا ہوا قرآن کیسے یاد کیا جائے؟ طلبہ، فضلاء اور مدرسین کی تربیت کے رہنما اصول وغیرہ شامل ہیں۔ دونوں انٹرویوز کو ایک ہی تسلسل میں پیش کیا گیا ہے۔ استفادے میں آسانی کے پیش نظر موزوں عنوانات بھی لگا دیے گئے ہیں۔

سفرِ زندگی پر ایک نظر

سوال

حضرت قاری صاحب! آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ آپ کی زندگی کا سفر کہاں سے اور کیسے شروع ہوا؟ از راہِ کرم تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب

میری پیدائش سَن 1946ء کے آغاز میں انڈیا کے ضلع کرنال میں ہوئی۔ انڈیا سے ہجرت کرنے کے بعد ہم پاکستان کے مشہور تاریخی شہر ملتان منتقل ہو گئے تھے۔ پھر ملتان کے ایک اسکول میں میرا داخلہ ہوا اور میں نے صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ میرے والد صاحب اگرچہ ایک عام کاروباری انسان تھے لیکن میرے والد صاحب کو شروع ہی سے نمازوں کا بہت زیادہ شغف تھا اور وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے۔ وہ ہمیں بچپن سے ہی اپنے ساتھ نمازوں کی ادائیگی کے لیے مسجد لے کر جاتے اور ساتھ ہی واپس لے آتے تھے۔ ہم نے اپنے والد صاحب کو بچپن سے دیکھا کہ انہیں علماء کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ہمارے محلے کی ایک مسجد، جس کو "ایک مینار والی مسجد" بھی بولتے ہیں، وہاں کے خطیب، امیرِ ختمِ نبوت مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے، میرے والد صاحب ان کے خطبات پابندی سے سنتے، پھر ان سے متاثر ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک ذہن سازی ہو رہی تھی۔ میرے والد صاحب ظاہری طور پر بغیر داڑھی اور پینٹ کوٹ میں رہنے والے انسان تھے، لیکن الحمد للہ! وہ ذہنی طور پر ایک مکمل دین دار انسان تھے۔ میں نے سکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران ہماری اسی مسجد میں میرے مادرِ علمی جامعہ خیر المدارس کے استاد حافظ عبدالرحیم صاحب اس مسجد میں امام تھے۔ وہ عصر کی نماز پڑھانے آتے تو نمازِ عشاء تک وہیں موجود رہتے تھے تو ان کے جو مدرسے والے

طلباء تھے، وہ سب اسی مسجد میں آجاتے اور پھر مغرب کے بعد پڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔

میرے والد صاحب نے مجھے ان کے سپرد کیا کہ میرا یہ بچہ ناظرہ آپ کے پاس پڑھے گا۔ پھر میں نے پرائمری کے دوران ہی سارا ناظرہ قرآن مجید ان کے پاس مکمل کرلیا۔ پرائمری جماعت تک پہنچنے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مسجد کے ساتھ یوں ایک تعلق بنادیا۔ ہمارے استاد قاری عبدالرحیم صاحب نے ہمارے لیے یہ ترتیب بنادی تھی کہ میں نے نماز فجر مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ پڑھنی ہے اور نماز کے بعد جب تک نمازی چلے نہ جائیں میں نے مسجد میں ہی رہنا ہے اور اس کے بعد مسجد کی صفائی کر کے اور ساری صفیں سمیٹ کر ہی گھر جانا ہے۔ حالانکہ تب ہمارا بچپن تھا، اس وقت ہم چھوٹے تھے، اسکول کے طالب علم تھے، لیکن ہم نے اپنے استاد کی اس بات کو سنجیدہ لیا اور پابندی سے اس کام کو انجام دیتے رہے۔ اسی طرح عصر سے پہلے مسجد کی صفائی کر کے ساری صفیں بچھانا وغیرہ۔ الحمدللہ! اسی وقت سے مسجد کی صفائی، صفیں بچھانا، مسجد کا ادب، مسجد سے محبت اور پڑھائی یہ سب کچھ اسی وقت ہمارے اندر پختہ ہو گیا۔ جب پرائمری سے فارغ ہوئے تو اللہ نے فضل فرمایا کہ میرے والدین (خدا ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے) انہوں نے مجھے حفظ کے لیے قاری عبدالرحیم صاحب کے مشورے سے جامعہ خیر المدارس میں داخل کروادیا۔ میں نے وہاں حافظ محمد دین صاحبؒ کے پاس قرآن پاک حفظ کرلیا۔

حفظ کے بعد میرے والدین نے سوچا کہ میں نے چونکہ پرائمری سے اپنی تعلیم چھوڑ دی تھی تو اب مجھے آگے اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے، لہٰذا حفظ سے فارغ ہو کر پھر چھٹی کلاس میں داخلہ لے لیا اور اس کلاس کی ساری کتابیں وغیرہ بھی خرید لیں۔ ہمارے اسی محلے کے ایک حاجی صاحب تھے، انہوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ میں کئی دنوں سے یہاں یاسین کو پھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ فارغ ہو گئے ہیں؟ میرے والد صاحب نے کہا کہ نہیں! اس نے قرآن حفظ کرلیا ہے تو اب پھر اسکول میں داخلہ لیا ہے۔ انہوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ قرآن پاک تو حفظ کرلیا ہے، لیکن اصل مرحلہ تو گردان کا ہوتا ہے، اس کے

بعد ہی قرآن یاد رہتا ہے۔ پھر انہوں نے مدرسے میں داخلے کے لیے میرے والد صاحب کا ذہن بنایا تو میرے والد صاحب نے بھی میرے داخلے کے لیے ان سے وعدہ کرلیا۔

پھر انہوں نے میرے والد سے کہا ہم نے گردان کی کلاس میں داخلے کے لیے قاری صاحب (حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ) کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ دو شوال عید سے اگلے دن ہی ہم قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؒ حاجی صاحب کے جاننے والے تھے۔ حاجی صاحب نے قاری صاحبؒ سے میرے داخلے کے بارے میں بات کی تو انہوں نے اپنی درسگاہ میں میرا داخلہ کرنے سے انکار فرمادیا، کیونکہ مزید داخلے ہونا بند ہوگئے تھے۔ اصل میں حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کی درسگاہ میں داخلے کی ترتیب یہ تھی کہ ہر سال اس کلاس کے جتنے بچے مدرسے سے فارغ ہوتے تھے، اگلے سال اتنی ہی تعداد میں بچے اسی کلاس میں داخل ہوتے تھے اور اس کے لیے بھی قرعہ اندازی ہوتی تھی اور جب ہم گئے تو اس وقت تک یہ سارا مرحلہ گزر چکا تھا۔ حاجی صاحب نے اور میرے والد صاحب نے قاری صاحبؒ سے میرے داخلے کے لیے کافی منت سماجت کی۔

پھر حضرت قاری صاحبؒ نے میرے داخلے کے لیے ایک شرط لگادی کہ میں ایک شرط کے ساتھ اس کو داخلہ دیتا ہوں (لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو الہام ہوا تھا یا ان کے دل میں کوئی بات آئی) اور وہ سمجھ گئے کہ ان کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ پھر حضرت نے یہ شرط لگائی کہ گردان کے بعد اس نے عالم بننا ہوگا! میرے والد صاحب اس بات پر خاموش ہوگئے اور حاجی صاحب جو ساتھ موجود تھے، وہ والد صاحب کو فرمانے لگے کہ ٹھیک ہے۔ بس آپ ہاں کردیں! آگے اللہ سب بہتر کرے گا، تو پھر میرے والد صاحب نے اس بات کے لیے ہاں کردی۔ اس طرح قاری صاحبؒ کے ہاں میرا داخلہ ہوا اور میرا تعلیمی سلسلہ وہیں سے شروع ہوگیا۔

وہاں ایک سال گردان کا مرحلہ میں نے قاری صاحبؒ کی نگرانی میں مکمل کیا اور الحمد للہ! بڑی خوش اسلوبی سے میں نے اس مرحلے کو پار کیا۔ بطور شہری [مقامی] طالب علم کے میرا گھر مدرسے کے ساتھ ہی تھوڑے فاصلے پر تھا تو میں عشاء تک وہاں پڑھتا اس کے بعد پھر گھر چلا

جاتا۔اگلے سال جب کتابیں (درسِ نظامی) پڑھنے کا مرحلہ شروع ہوا تو اس میں بھی میری وہی ترتیب شروع ہوگئی، یعنی عشاء تک وہیں پڑھنا، پھر اس کے بعد واپس گھر چلے جانا۔اب پتہ نہیں حضرت نے مجھ پر کیا نظر رکھی ہوئی تھی کہ حضرت کے خادم ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ حضرت قاری صاحب عشاء کے بعد تھوڑی تعلیم فرماتے ہیں۔جس میں ہمارے اسلاف کے حالات زندگی ہمیں سناتے ہیں اور یہ کوئی عمومی تعلیم نہیں ہوتی۔اس میں ہمارے بھائی قاری محمد طاہر صاحب اور ہمارے ساتھی عبداللہ صاحب (جواب مدینہ منورہ میں مقیم ہیں) اور پانچ چھ افراد اور ہوتے ہیں اس کے علاوہ کوئی اور بہت بڑا مجمع نہیں ہوتا۔حضرت قاری صاحبؒ خود ہمارے اسلاف کے حالات ہمیں سناتے ہیں۔

ان خدام میں سے ایک خادم نے مجھے کہا کہ تم عشاء کے بعد بھاگنے کی کرتے ہو تو عشاء کے بعد تھوڑی دیر حضرت کی مجلس میں بیٹھ جایا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ میں وہاں کیسے بیٹھ سکتا ہوں وہاں تو آپ جیسے بزرگ لوگ موجود ہوتے ہیں۔میں وہاں چھوٹا بچہ کیا کروں گا؟اور پتہ نہیں حضرت قاری صاحب مجھے اس بات کی اجازت دیں گے بھی کہ نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات پر ناراض ہو جائیں!انہوں نے کہا کہ بس آپ آجایئے گا۔میں آپ کے لیے حضرت قاری صاحبؒ سے اجازت لے لوں گا۔انہوں نے مجھے پکڑ کر وہاں ایک دن مجلس میں بٹھا دیا۔جب مجلس اور دعا ہوگئی تو وہ خادم قاری صاحبؒ سے فرمانے لگے کہ یہ یاسین کا شوق ہے کہ میں بھی عشاء کے بعد تھوڑی دیر اس مجلس میں بیٹھ جایا کروں، حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا:اچھا ٹھیک ہے بیٹھ جایا کرو۔

اس طرح حضرت قاری صاحبؒ سے قرب کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔چند دنوں کے بعد حضرت نے مجھ پر یہ پابندی لگادی کہ اگر آپ نے عالم بننا ہے تو پھر عشاء کے بعد گھر نہ جایا کرو بلکہ ایک ہفتے کے بعد چلے جایا کرو،یہیں رہو اور کھانا بھی جو یہاں سے ملے وہی کھاؤ، نہ کھانا گھر سے منگوانا ہے اور نہ باہر سے۔میں نے کہا ٹھیک ہے، حضرت جیسا آپؒ نے فرما دیا۔میں نے اس وقت سے لے کر دورہ حدیث کے ختم ہونے تک پوری طرح سے اس بات کو

نبھایا۔ جمعے والے دن صبح کو چھٹی ہوتی تو میں گھر جاتا لیکن پھر حضرت کے پیچھے آکر نماز جمعہ پڑھنا، پابندی سے جاری رہا۔ صرف وہی دو تین گھنٹے گھر میں گزرتے۔ میں نے اس پابندی کو دورہ حدیث تک نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا اور اس کے بعد پھر ہر مرحلے میں میری مرضی گویا ختم ہوگئی تھی۔

عملی زندگی اور تدریس

میں نورانی قاعدے کے لیے جامعہ خیر المدارس، ملتان میں داخل ہوا تھا اور پھر سن 1970ء میں جامعہ خیر المدارس، ملتان سے میری فراغت ہوئی۔ جب کبھی بھی میں حاضر ہوتا میرے اکثر اساتذہ بڑے فخر سے فرماتے تھے یہ ہمارا وہ شاگرد ہے جس نے نورانی قاعدہ سے لے کر دورہ حدیث تک ہمارے پاس پڑھا ہے۔ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد کچھ جگہیں حضرت کے ذہن میں تھیں اور مختلف شہروں سے کچھ لوگوں نے میرے بارے میں حضرتؒ سے پہلے ہی رابطہ کیا ہوا تھا کہ یہ شاگرد ہمیں دے دیں۔ حضرت مجھے فرمانے لگے یہ چار پانچ جگہیں ہیں، آپ استخارہ کرلیں۔ میں نے عرض کیا حضرتؒ آپ ہی استخارہ فرمالیں اور فیصلہ بھی آپ ہی فرمادیں۔ جہاں آپ فرمائیں گے میں وہیں حاضر ہو جاؤں گا! فرمانے لگے ٹھیک ہے۔ حضرت نے میری تشکیل رحیم یار خان میں فرمادی۔ میں نے چند ماہ وہاں رہ کر پڑھایا۔ پھر سن 1971ء یا 1972ء کی بات ہے جب وہاں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، تو وہ سارا علاقہ بھی اور سارے کا سارا مدرسہ بھی اس سیلاب کی نذر ہو گیا۔ تب ہم واپس حضرت کی خدمت میں ملتان پہنچ گئے۔ پھر حضرت نے وہاں سے میری تشکیل فیصل آباد کے لیے فرما دی (پہلی تشکیل امُ المدارس اور دوسری تشکیل باغ والی مسجد، ماڈل ٹاؤن سی، فیصل آباد میں)

اور اس طرح میں سن 1973ء سے یہاں باغ والی مسجد میں ہوں۔

پہلے والے مدرسے میں (ام المدارس میں) میرے پاس طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد تھی، لیکن باغ والی مسجد آئے تو یہاں کوئی مدرسہ ہی نہ تھا بلکہ یہ تو صرف ایک مسجد تھی۔ جب

میں یہاں آیا تو دیکھا کہ نہ تو یہاں کوئی تعلیم ہے اور نہ مدرسے کا نام ونشان ہے۔ بس ایک بزرگ امام صاحب تھے جو صبح کے وقت ناظرہ کی کلاس پڑھاتے تھے۔ وہ حضرت، جو حضرت قاری صاحبؒ سے مجھے یہاں کے لیے لائے تھے، وہ فرمانے لگے کہ آپ یہاں قیام فرمائیں، ان شاءاللہ! اللہ تعالیٰ کسی کو بھیج دے گا، لیکن میرے پاس نہ کوئی ناظرہ کا بچہ تھا اور نہ ہی حفظ کا، یعنی کچھ بھی یہاں نہیں تھا۔ ابھی دو چار دن ہی گزرے تھے (چونکہ طبیعت میں شروع سے مسجد کی صفائی ستھرائی، اس کی دیکھ بھال کا جذبہ موجود تھا) تو میں نے دیکھا کہ اس چھوٹی سی مسجد کا اوپر والا حصہ مکمل طور پر بے کار اور کباڑ والی چیزوں سے بھرا ہوا تھا، اور جو بھی اللہ کا بندہ مسجد کی صفائی کے لیے آتا، وہ مسجد کی صفائی کرنے کے بعد سارے تنکے وغیرہ مسجد سے باہر پھینکنے کے بجائے مسجد کے اس اوپر والے حصے میں ہی پھینک دیتا تھا۔ میں نے ایک دو دن لگا کر اس اوپر والے حصے کی صفائی خود کی اور سارا کباڑ باہر نکال دیا۔

انہی دنوں میں چار سال کے ایک بچے کو ان کے والد صاحب میرے پاس لے کر آئے کہ آپ نے اس بچے کو پڑھانا ہے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ خدایا تیرا شکر ہے کوئی طالب علم تو آپ نے میرے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا ہے۔ میرا وہ شاگرد اب بھی جب مجھ سے ملتا ہے تو میں ان سے یہی کہتا ہوں کہ آپ ہی میرے پہلے شاگرد تھے، جن کو میں نے سب سے پہلے پڑھایا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، پانچ سات بچے یہاں اور بھی آ گئے، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ کچھ بچے ایسے بھی تھے جو مسجد میں مقیم ہونے کے لئے بھی آ گئے، لیکن جو شخص مجھے لے کر آیا تھا اس نے کہا کہ ہمارا تو یہی طے ہوا تھا کہ یہاں کوئی بھی بچہ مقیم نہیں رکھنا، کیونکہ یہ مسجد ہم نے شہریوں کے لیے بنائی ہے تو میں بھی خاموش ہو گیا، لیکن جب وہ تین چار بچے آئے (جو رہائش رہ کر پڑھنے والے تھے) تو میں نے ان کو داخلہ دینے کے بجائے منتظمین مسجد کے پاس بھیج دیا لیکن انہوں نے تو انکار کر دیا، پھر ان بچوں کے والدین کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ یہ تین چار بچے ہیں ان کو اپنے ساتھ ہی مسجد میں رکھ لیں۔

انہوں نے یہ تو کہہ دیا کہ بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں مقیم کرلیں، لیکن یہ بچے یہاں رہیں گے کیسے؟ کھائیں گے کیسے؟ اس بات پر وہ مکمل خاموش تھے۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میرا کھانا محلے کے ایک گھر میں لگا ہوا تھا، صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا وہاں سے آتا تھا۔ جب وہ کھانا میرے لیے آتا تو مسجد کے سامنے ایک تندور تھا، میں وہاں سے بچوں کے لیے کھانا لے کر آتا اور دسترخوان پر لگا کر ہم سب مل کر اکٹھے بیٹھ کر کھا لیتے تھے۔ مسجد میں رہنے کے لیے کوئی الگ سے مکان تو تھا نہیں اور یہ بچے گھر کی طرف سے بھی کافی غریب تھے۔ اس طرح دن گزرتے گئے۔ پھر جب بچوں کی تعداد اور زیادہ ہوگئی تو پھر ایک دن، ایک حاجی صاحب (خدا ان کی مغفرت فرمائے) جب ان کا ایک بچہ داخل ہوا تو انہوں نے جب مزید دس بارہ بچوں کو دیکھا تو کہنے لگے ان سب بچوں کا سالن میں اپنے گھر سے بنا کر لے آؤں گا اور روٹی آپ یہیں سامنے والے تندور سے لے لیا کریں۔

اس زمانے میں شہری (غیر رہائشی) بچے تو پڑھ کر چلے جاتے تھے لیکن وہ تین چار بچے میرے ساتھ مسجد میں ہی مقیم تھے۔ میرے لیے بھی سونے اور لیٹنے کے لیے اس اوپر والے ہال کے علاوہ کوئی جگہ نہیں تھی۔ بس اسی ہال میں سونا، بیٹھنا، کھانا، پڑھنا، بس ہماری ساری کائنات وہی ایک ہال تھا۔ پھر جب گرمیوں کے دن آئے تو اس اوپر والے ہال میں بہت زیادہ تپش ہوتی تھی۔ نیچے مسجد میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں مشکل سے دو آدمی لیٹ سکتے تھے۔ میں نے خادمِ مسجد سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو دوپہر میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ چھٹی کے بعد میں یہاں آرام کرلیا کروں، اوپر ہال میں بہت زیادہ تپش ہے۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ نہیں میں نے خود بھی آرام کرنا ہوتا ہے، تو میں اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ نہ سونے کے لیے جگہ تھی، نہ کوئی مہمان خانہ تھا، نہ مکان، نہ کوئی اور سہولت، بس اپنے استاد حضرت قاری صاحب کے حکم پر وہاں بیٹھا رہا۔ الحمد للہ! وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت قاری صاحب کی توجہات اور بڑے حضرت قاری صاحبؒ (قاری فتح

محمد پانی پتی صاحب) کی توجہات ایسی شاملِ حال ہوئیں کہ کچھ عرصے کے بعد یہاں طلباء کا رجوع شروع ہوگیا۔ ان دنوں میں یہاں بڑے حضرت خود تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ غالباً سن 1978ء کی بات ہے۔ جب وہ یہاں تشریف لائے تھے تو اس وقت میری درسگاہ سے سب سے پہلی جماعت حفظ کرکے فارغ ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً سات حافظِ قرآن بچے تھے۔ حضرتؒ نے ان کا امتحان لیا اور اس وقت دو تین دن بڑے قاری صاحبؒ نے یہاں قیام بھی فرمایا۔ اس وقت کے کچھ ساتھی ہیں جو ابھی تک بھی موجود ہیں۔ قاری صاحبؒ نے ان سے فرمایا: بھائی ماشاء اللہ! ہمارے یاسین نے تو فیصل آباد کو ملتان بنا دیا ہے۔ یہ الفاظ حضرت بڑے قاری صاحبؒ کے میرے بارے میں تھے اور ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ وہاں پر حضرت قاری صاحبؒ (قاری رحیم بخش صاحبؒ) نے ایک مضبوط کام شروع کیا تھا جس کی ایک جھلک انہیں یہاں پر بھی نظر آئی، جس وجہ سے انہوں نے میرے کام کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی۔

جبکہ اس وقت یہاں مدرسہ کا کوئی نام ونشان بھی نہیں تھا۔ بس یہی ایک باغ والی مسجد تھی تو جب آپ بچوں کے امتحان کے بعد رپورٹ لکھنے لگے تو فرمایا کہ مدرسہ کا کیا نام ہے؟ میں نے عرض کیا کوئی نام نہیں ہے! بس آپؒ جو نام تجویز فرمادیں۔ حضرتؒ کے ساتھ جو خادم آئے ہوئے تھے۔ ان کا نام غالباً ضیاء الدین یا ضیاء اللہ یا اس طرح کا کوئی نام تھا، تو فرمانے لگے کہ ضیاء الدین! تو پھر اس مدرسہ کا نام ضیاء القرآن ہی رکھ دوں؟ پھر حضرتؒ نے اس کا نام "مدرسہ ضیاء القرآن" ہی تجویز فرمادیا، لیکن تب بھی صورت وہی باغ والی مسجد کی ہی رہی۔ کچھ عرصے بعد اس چھوٹی سی جگہ پر تعداد کی زیادتی کی وجہ سے بچوں کے لیٹنے اور سونے کے لیے بھی جگہ کم پڑگئی۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ اس چھوٹی سی جگہ میں گزارا کرنا مشکل ہوگیا، ہمیں کوئی اور جگہ دیکھنی چاہیے۔ اس وقت تک بحمداللہ! بچوں کی تعداد 500 کے قریب پہنچ چکی تھی، کیونکہ تب تک اس مسجد میں کچھ تعمیرات بھی ہو چکی تھیں۔ میرا کمرہ بھی بن گیا تھا، اس کے علاوہ کچھ اور کمرے اور ہال بھی تعمیر ہو چکے تھے۔ یہ سن 1980ء کے قریب قریب کی بات ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ہمارا یہ قرآن ہال جب بن رہا تھا اس وقت حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ

تشریف لائے تھے اور اسی ہال میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ چونکہ وہ ہال بہت بڑا تھا، لیکن اس وقت بچوں کی تعداد محدود تھی تو مجھے فرمانے لگے بس محنت سے لگے رہو! ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن یہ ہال بھی بھر جائے گا۔

یہاں جو قرآن ہال بنا ہے (موجودہ ہال کی طرف اشارہ) یہ اس وقت کے قرآن ہال سے چار گنا بڑا ہے۔ بس یہ سب کچھ اللہ کے خاص فضل اور ان بزرگوں کی توجہات اور ان کی دعائیں ہی تھیں، جو مجھے اس طرف لے کر آئیں۔ چند دن پہلے کچھ حضرات یہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ سن 1990ء میں اس زمین (جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن والی جگہ) کو خریدا گیا تھا اور اس جگہ کی وسیع تعمیرات، اس کی وسعت کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ یہ عرصہ تو بہت تھوڑا ہے، اتنی بڑی جگہ کی خریداری اور پھر اس کے اوپر اتنی زیادہ تعمیرات اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ اگر مجھے اجازت ہو اور کسی کو اس پر اعتراض نہ ہو تو میں یہ کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہمارے بزرگوں کے تصرفات ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔ میں تو انہیں کی توجہات اور تصرفات کا ہی یہ سارا نتیجہ سمجھ رہا ہوں۔ الحمدللہ! اس تھوڑے سے عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی جگہ، اتنی وسیع تعمیرات اور اتنی بڑی تعداد پڑھنے والوں کی عطا فرمادی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔

پھر میں نے ان سے کہا (آنے والے مہمان حضرات کو کم وقت میں ترقی اور کام کی وسعت کی وجہ بتاتے ہوئے) کہ ایک بات تو یہ تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک میرے دل میں اپنے اساتذہ کے لیے ان کی غیبت اور چغلی کا کبھی میرے دل میں خیال بھی نہیں آیا۔ یہ بات میں نے ان لوگوں کو واضح طور پر کہی کہ میرے لیے میرے تمام اساتذہ، چاہے جن سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے یا تعلیم حاصل نہیں کی۔ ان سب سے میرا محبت اور پیار کا تعلق آج تک بھی قائم ودائم ہے اور یہ جو اساتذہ کی توجہات اور ان کی دعائیں ہوتی ہیں نا، یہ اصل میں بنیاد ہوتی ہیں ترقی کی۔ روحانی اور علمی سلسلے میں آگے بڑھنے کے لیے اس میں ظاہری کاوشیں اپنی جگہ پر ہیں، لیکن اس میں نورانیت، برکات اور قبولیت انہی چیزوں سے ہی

پیدا ہوتی ہے۔جب ہمارے حضرت قاری صاحبؒ کا سن 1982ء میں انتقال ہوا تو اس وقت سے لے کر آج تک روزانہ مسجد میں نماز ظہر کے وقت جس میں سارے شعبہ جات کے طلباء موجود ہوتے ہیں، سب کے سب لوگ سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، ائمہ تبعین، صلحاء، شہداء کے لیے اور پھر آگے جن اساتذہ سے ہم نے پڑھا ہے ان کے لیے اور مدرسے کے معاونین کے لیے ایصال ثواب اور دعا کی جاتی ہے۔اس کام کی برکات ہمیں کھلی آنکھوں سے نظر بھی آتی ہیں۔

میرے اساتذہ کرام کی خصوصی شفقت

سوال

حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ کا تربیت کے حوالے سے کوئی واقعہ سنائیں؟

جواب

اس سے پہلے میں ایک اور بات سنانا چاہتا ہوں، جو اکثر میں اپنے بچوں اور طلباء کو سناتا رہتا ہوں۔ ہمارے ماحول سے کچھ بنیادی چیزیں نکل گئی ہیں۔ایک بنیادی چیز جس سے ہمارا ماحول خالی ہو چکا ہے، وہ ہے: بچوں کا مسجد سے تعلق رکھنا۔مثال کے طور پر جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے (سن چھیالیس کی میری پیدائش ہے اور اِس وقت میری عمر 75 سال ہے) ہمارے بچپن میں مسجد بچوں کو قرآن اور دینی تعلیم سے جوڑنے کا ایک بڑا ذریعہ ہوتی تھی۔ جب میں پرائمری میں پڑھتا تھا تو میرے والد صاحب نے یہ ترتیب بنائی تھی کہ صبح فجر کے وقت مسجد میں جانا ہے۔سکول سے پہلے مسجد کے امام جامعہ خیر المدارس کے استاد حافظ عبدالرحیم صاحبؒ تھے اور ایک ان کے نائب امام تھے۔صبح نماز فجر کے بعد نائب امام ناظرہ پڑھاتے تھے۔اس کے بعد ہم لوگ مسجد کی صفائی اور صفیں لپیٹ کر رکھتے پھر گھر جاتے۔ناشتہ کر کے پھر سکول چلے جاتے اور عصر سے عشاء تک کا وقت بھی مسجد میں ہوتے۔گھر والوں کی ترغیب بھی یہی ہوتی۔جب میں نے ناظرہ مکمل کر لیا اور پرائمری تک تعلیم حاصل کر لی تو حافظ

عبدالرحیم صاحب نے میرے والد صاحب کا ذہن بنایا اور ان کو تیار بھی کرلیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہماری مسجد کے خطیب مولانا محمد علی جالندھری تھے۔ اگر وہ کبھی نہ آسکتے جو جمعہ کے خطاب کے لیے ختم نبوت کے کسی مبلغ کو بھیج دیتے۔ رمضان کا مہینہ تھا انہوں نے جمعہ کے لیے مولانا لقمان علی پوری کو بھیجا انہوں نے فضائل قرآن کے موضوع پر زوردار خطاب کیا۔ وہ خطاب سننے کے بعد والد صاحب نے مجھے حفظ کے لیے مدرسے میں داخل کرادیا، جب میں نے حفظ مکمل کرلیا۔ پھر چھٹی جماعت کے لیے مجھے اسکول میں داخل کرادیا گیا، میرا داخلہ بھی ہو گیا اور کتابیں بھی مل گئیں تو ہمارے عزیزوں میں سے ایک بزرگ تھے، حاجی عبدالحمید صاحب انہوں نے والد صاحب سے فرمایا کہ کافی دنوں سے میں یاسین کو اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

والد صاحب نے کہا وہ پڑھ کر فارغ ہو گیا ہے۔ اب میں نے اسے سکول میں داخل کرادیا ہے۔ بزرگ فرمانے لگے: لاحول ولاقوة الا بالله یہ تم نے کیا کیا؟ اس نے تو ابھی حفظ کیا ہے اور یہ حفظ محفوظ رہ ہی نہیں سکتا جب تک گردان نہ کرے۔ بزرگوں نے والد صاحب کو ترغیب دے کر سمجھایا تو پھر والد صاحب تیار ہو گئے پھر گردان کے لیے مجھے مدرسے میں لے گئے۔ قاری رحیم بخش کی درسگاہ میں داخلے کا یہ معمول تھا کہ ہر سال جتنے طلباء گردان سے فارغ ہوتے اتنے ہی پھر اور رکھتے اس سے زیادہ نہ رکھتے۔ اس میں بھی یہ ہوتا تھا کہ پہلے ہی داخلہ کی درخواستیں جمع ہو جاتیں، خطوط آجاتے، پھر قرعہ اندازی ہوتی جس کا نام آجاتا اس کو آپ خود لکھتے کہ آپ نئے سال سے تشریف لے آنا۔ آپ یہ سب کام رمضان سے پہلے پہلے مکمل کر لیتے تھے۔ اب مجھے تین شوال کو حافظ صاحب، حضرت قاری صاحب کے پاس لے گئے۔ مجھے حضرت جانتے تھے کیونکہ میں نے حفظ بھی وہیں کیا تھا، قاری رحیم بخشؒ نے فرمایا داخلے تو مکمل ہو گئے ہیں اب گنجائش نہیں ہے، حاجی عبدالحمید صاحب کا تعلق حضرت قاری رحیم بخشؒ کے ساتھ تھا۔

انہوں نے حضرت کو کہا کہ حضرت! یہ تو سکول میں داخل ہو چکا تھا، میں منت کر کے اس کو

لے آیا ہوں۔ آپ مہربانی فرمائیں۔ حضرت نے ایک شرط لگائی کہ فرمایا یہ سکول والے ہیں، یہ حفظ مکمل کرنے کے بعد سکول چلا گیا تھا، اب آپ اس کو لے آئے ہو تو گردان کے بعد اس نے پھر سکول چلے جانا ہے۔ میری شرط ہے کہ گردان کے بعد اس نے کتابیں بھی پڑھنی ہیں (درسِ نظامی مکمل پڑھے گا) حاجی عبدالحمید صاحب کو فکر پڑ گئی، انہوں نے اس پر بھی والد صاحب کو تیار کیا، والد صاحب نے ہاں کی تو میرا داخلہ ہو گیا۔ ٹھیک ایک سال گزرنے کے بعد حضرت قاری صاحب نے مجھے آہستہ آہستہ قریب کرنا شروع کر دیا۔ حضرت قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، آپؒ، شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان کے ہم کلاس تھے۔

سوال

قاری صاحب! ایک سوال میرے ذہن میں آرہا ہے، وہ یہ کہ پہلے آپ کے استادِ محترم قاری صاحب، آپ کو اپنی درس گاہ میں داخلہ ہی نہیں دے رہے تھے، پھر اپنا شاگرد خاص بنایا، پھر خدمت کے مواقع دیے اور بالآخر اپنا داماد اور بیٹا بنا کر آپ کو اپنے خاندان کا ہی حصہ بنا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ وضاحت فرما دیں! (بے ادبی کی معذرت!)

جواب

آپؒ کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پہلی بیوی سے تھے جو کہ انتقال کر گئی تھیں، جبکہ باقی اولاد دوسری بیوی سے تھی۔ حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ نے اپنی تمام بچیوں کی جن سے شادیاں کیں وہ سب حافظ قرآن تھے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں بچی کا رشتہ اس کو دوں گا جو حافظ قرآن ہو۔ صرف حافظ قرآن ہی نہیں بلکہ عالم بھی ہو اور مدرس بھی ہو یعنی قرآن کریم کی خدمت کرتا ہو۔ تقریباً 13 سال کا عرصہ میں نے حضرت کی خدمت اور صحبت میں گزارا، انہوں نے مجھے ہر طرح سے جانچ لیا، چھانٹ لیا، تعلیم بھی دی، اصلاح بھی کی، پہلے اس قابل بنایا، اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کیا۔ دورہ حدیث سے فراغت کے فوراً بعد رحیم یار خان میں تدریس کے زمانے میں میرا نکاح ہوا۔

میرے اساتذہ کرام کا اندازِ تربیت

سوال

قاری صاحب! آج کل عام طور پر ہمارے فاضلین فراغت کے بعد، اساتذہ سے دور ہو کر بکھر جاتے ہیں اور بسا اوقات بگڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ فرمایئے کہ ان فضلائے کرام کو بڑوں سے کیسے جوڑا جائے؟

جواب

❁ ہمارے استاد محترم قاری محمد دین صاحب جو ہمارے ابتدائی استاد تھے، انہوں نے مجھے کیسے بڑوں کے ساتھ جوڑا؟ میں معلمین کی مجالس میں یہ واقعہ سناتا رہتا ہوں۔ جامعہ خیر المدارس میں اس وقت بجلی بہت ہی کم تھی، بجلی والے پنکھے بھی نہیں تھے، یہاں مسجد بھی نہیں تھی ، بلکہ صرف ہال بنا ہوا تھا، جہاں نماز وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ مجھے اپنے استاد نے فرمایا کہ جب حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب ؒ، (جو قاری حنیف جالندھری کے دادا اور حضرت تھانوی ؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے) جب نماز پڑھنے آتے ہیں تو آپ ان کے پاس کھڑے ہو کر دستی پنکھے سے ان کو ہوا دیا کریں۔ میں حضرت کو نماز کے وقت ہوا دیا کرتا تھا۔ جب تک حضرت نماز پڑھتے میں ہوا دیتا رہتا۔ جب حضرت فارغ ہو کر چلے جاتے تو میں بھی درس گاہ میں چلا جاتا۔ اسی طرح عشاء کے وقت جب تک حضرت سنتیں اور وتر پڑھتے رہتے میں انہیں پنکھے سے ہوا دیتا رہتا، جب تک حضرت چلے نہ جاتے میں لگاتار ہوا دیتا رہتا تھا۔ اس طرح ہمارے استادوں نے ہمیں بڑوں کے ساتھ جوڑا اور خدمت کرنا سکھائی۔ اپنے اکابر سے جڑے رہنے اور اپنے بڑوں کی خدمت کرنے میں ہی کامیابی ہے۔ اس وقت ایسے استاد ہوتے تھے!

❁ اسی طرح گرمی کے موسم میں دو پہر کو حضرت قاری رحیم بخش صاحب ؒ ظہر سے قبل غسل فرماتے تھے۔ مدرسے میں کچن کے ساتھ ایک کنواں ہوتا تھا، اس سے ڈول کھینچ کر غسل خانے

میں پانی بھرا جاتا تھا، تو استاد جی نے میرے ذمے لگایا کہ آپ دوپہر کے وقت ڈول کھینچ کر پانی حوض میں بھر دیا کریں، حضرت غسل فرماتے ہیں، میری عمر بھی کم تھی اور جسم بھی اتنا مضبوط نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی، یہ خدمت بھی میں کرتا تھا۔ الحمد للہ علی ذلک!

❁ اسی طرح استادوں کی تربیت اور انداز تربیت کا ایک واقعہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ اس وقت ہم پائجامہ پہنتے تھے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے ایک دن فرمایا: یاسین! یہ پائجامہ آپ کو اچھا نہیں لگتا! بس اتنا فرمایا اور چلے گئے۔ میں رات کو چھٹی کر کے اپنے گھر گیا، اپنی والدہ سے ذکر کیا کہ ہمارے بڑے استادوں نے ایسے فرمایا ہے: ''یہ پائجامہ اچھا نہیں لگتا!'' تو میری والدہ مرحومہ (اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے) نے راتوں رات سلائی مشین پر میری شلوار بنائی اور میں صبح وہ پہن کر مدرسے آ گیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی پائجامہ استعمال نہیں کیا۔

سوال

اس سے ہمیں یہ سبق مل رہا ہے کہ آج کل کے فضلائے کرام کو بھی چاہیے کہ کسی اللہ والے کی صحبت اختیار کریں اور ان سے اپنے آپ کو جوڑیں، لیکن عموماً آج کل یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوئے، یہ جا اور وہ جا۔ خدمت کا جذبہ ہی نہیں۔ آپ کے ہاں ماشاء اللہ! میں نے دیکھا کہ طلبا بھی خدمت کر رہے ہیں اور استاد بھی خدمت کر رہے ہیں، لیکن اکثر جگہوں پر طلبائے کرام میں یہ دونوں چیزیں (خدمت کا جذبہ اور اساتذہ سے محبت) مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔

جواب

❁ میں آپ کو ایک مزیدار بات بتاتا ہوں۔ (یہ میں اس ضمن میں بتا رہا ہوں کہ بڑے اپنے چھوٹوں کو، بڑوں سے کس طرح جوڑتے تھے) جب میں پڑھ کر فارغ ہوا اور پڑھانا شروع کیا۔ تدریس کا پہلا سال مکمل ہوا تو قاری رحیم بخش صاحب نے مجھے خط لکھا اور تاکید فرمائی کہ آپ بڑے حضرت (قاری فتح محمد صاحبؒ) کو خط لکھو! میں نے حضرت قاری فتح محمد

صاحبؒ کو خط لکھا (جو قاری رحیم بخش صاحبؒ کے استاد تھے) کہ حضرت میں نے آپ کی دعا اور توجہات سے پڑھانا شروع کیا ہے تو آپ شفقت فرمائیں اور میرے طلباء کا امتحان لینے کے لیے تشریف لے آئیں، چنانچہ اس نصیحت کے موافق میں نے عمل کیا اور الحمدللہ! اس کے فوائد اور نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

❁ یہ سن 1971ء کی بات ہے۔ سن 70ء میں دورہ حدیث سے فارغ ہوا تھا۔ میرا تدریس کا یہ پہلا سال تھا، اس وقت میں رحیم یار خان میں تھا، پھر بڑے حضرت کا مجھے جوابی خط آیا کہ ماشاءاللہ! آپ کا خط پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے آپ کے طلباء کا امتحان کیا لینا ہے، بس میں آؤں گا، آپ کے پیارے پیارے بچوں کی پیاری پیاری آواز سن کر اپنے دل کو ٹھنڈا کروں گا۔ حضرت رحمہ اللہ پروگرام کے مطابق تشریف لے آئے۔ حضرتؒ امتحان لے رہے تھے تو مجھے ساتھ بٹھالیا کہ اِدھر بیٹھیے۔ جو اصلاح کے لیے بتانے کی بات ہوتی تو ساتھ ساتھ مجھے بتاتے جاتے۔ ایک بات حضرت کی مجھے اچھی طرح یاد آرہی ہے، قریب ہو کر فرمانے لگے کہ یاسین! تیرے شاگردوں کے پاس تو شیطان نہیں آتا ہوگا۔ ہوا یہ کہ حضرت نے ایک طالب علم سے ایک جگہ سے سنا۔ اس نے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کر دیا، دوسرے مقام سے سنا تو اس نے پھر تعوذ اور تسمیہ پڑھ کر شروع کیا۔ تیسری جگہ سے سنا تو اس نے پھر تعوذ اور تسمیہ پڑھ کر سنایا۔ حالانکہ اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے بڑے اپنے چھوٹوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ، اپنے شاگردوں کو استادوں اور بزرگوں کے ساتھ کیسے جوڑتے تھے۔ اور بڑے کس طرح چھوٹوں کو شفقت سے سکھاتے اور سمجھاتے تھے۔ آج کے استادوں میں یہ بات کہاں کہ وہ اپنے شاگردوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ جوڑیں تا کہ ان سے تعلق بھی بنے اور دعائیں بھی لیں۔

❁ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے یہاں فیصل آباد میں ایک مہینے کا اعتکاف فرمایا تھا۔ غالباً سن 81-1980ء کی بات ہے۔ میں اپنے بچوں کو حضرت کے پاس لے گیا۔ حضرت کے خدام تھے حاجی ابراہیم اور اسماعیل۔ ان کے بچے میرے پاس پڑھتے تھے،

ان خدام کے توسط سے اور قاری رحیم بخش صاحب کی نسبت سے حضرت شیخ الحدیث سے ہمارا تعارف تھا۔ حضرت شیخ الحدیث کی طرف سے، حضرت قاری رحیم بخش کو خلافت ملی ہوئی تھی۔ حضرت مجت فرماتے تھے تو میں نے برکت کے لیے اپنے بچوں کا قاعدہ حضرت شیخ الحدیثؒ سے شروع کرایا تھا۔ اس طرح میرے بچوں کا حضرت سے تعلق بن گیا، اور زیارت اور سبق کی نسبت حاصل ہوگئی۔

عالم دین اور تدریس قرآن

سوال

حضرت! جب ایک بندہ عالم دین بن کے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کسی اچھی جگہ پر امام و خطیب یا مدرس لگ جاؤں، لیکن آج کے دور میں اگر اس کو اپنے اساتذہ کی طرف سے یہ کہہ دیا جائے کہ آپ نے نورانی قاعدہ پڑھانا ہے تو وہ یہی سوچتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا عالم دین ہو کر قاعدہ پڑھا رہا ہے؟ حضرت! کیا آپ کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا؟ آج کل کے دور میں ایسا کیوں ہے؟ نیز اس بات کو ذہنوں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے؟

جواب

اس بارے میں سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتاؤں کہ اللہ کا شکر ہے میرے درس نظامی کا سارا مرحلہ بڑا اچھا اور محنت سے گزرا ہے اور اللہ کی توفیق سے میں نے اچھی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ ہمارے استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحبؒ (بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد) نے کتنی مرتبہ یہ فرمایا تھا بلکہ ترغیب بھی دی۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر آپ اس طرف آتے ہیں تو اس میں ترقی کے بہت زیادہ مواقع ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے مجھے یہی کہا، لیکن میں آپ کو اپنے حضرت قاری صاحبؒ کی ایک بات بتاؤں کہ ہمارے حضرت قاری صاحب کا مزاج یہ تھا کہ جیسے وہ فناء فی القرآن تھے، ایسے ہی ان کی یہی کوشش ہوتی تھی

کہ میرا ہر شاگرد چاہے وہ کسی بھی منصب پر پہنچ جائے، لیکن وہ قرآن کریم ضرور پڑھائے۔ان میں سے ہمارے قاری محمد طاہر صاحبؒ ان کی کتب احادیث میں علمی استعداد بڑے اونچے درجے کی تھی۔ جب حضرت نے ان کی تشکیل جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حفظ کے درجے میں پڑھانے کے لیے کر دی تو اس وقت مفتی محمود صاحب وہاں کے منتظم تھے۔ قاری محمد طاہر صاحبؒ حفظ قرآن کی درسگاہ لے کر بیٹھ گئے۔اس وقت مفتی محمود صاحب نے اپنے طور پر ان کو کہا کہ آپ ایک گھنٹہ دورہ حدیث کا سبق پڑھالیا کریں۔اس کے علاوہ باقی وقت میں آپ قرآن مجید پڑھائیں۔

یہ سب ان کی استعداد کے پیش نظر تھا اور قاری صاحب اپنے وقت میں پورے پاکستان کے وفاق المدراس العربیہ کے سالانہ امتحان میں اول نمبر پر آئے تھے، لیکن پھر بھی وہ حفظ کی درسگاہ میں بیٹھے۔اسی طرح ہمارے حضرت کے شاگرد قاری خلیل الرحمٰن صاحب ملتانی بھی پورے پاکستان میں وفاق المدارس العربیہ کے سالانہ امتحان میں اول نمبر پر آئے، لیکن ان کو بھی حضرت نے دارالعلوم کبیر والہ میں حفظ کی درسگاہ میں ہی بٹھایا، لیکن اس بات کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے حضرت کی اپنی ایک کوشش، ایک طریقہ اور ایک خاص تکنیک تھی۔ وہ اس تکنیک کو لے کر چلتے تھے۔اس طریقے سے دلوں میں ایک ایسی چیز پیدا ہو جاتی تھی کہ بس حضرتؒ ہمیں جو فرما رہے ہیں یہی حرف آخر ہے، اسی میں ہی ہماری خیر ہے اور یہی ہم نے کرنا ہے، جبکہ خیر المدارس کے کچھ بڑے اساتذہ اس بات کو محسوس بھی کرتے تھے کہ اتنے بڑے بڑے اور جید علماء فارغ التحصیل ہوتے جا رہے ہیں اور یہ ان کو قرآن کی درسگاہ میں بٹھاتے جا رہے ہیں۔

شعبہ حفظ کے لیے معیاری مدرس

سوال

آپ کی نظر میں ایک اچھا استاد بننے کے لیے، بالخصوص یہ مار پیٹ والا کلچر چھوڑ

کر، اچھے بچے اور اچھے حفاظ تیار کرنے کے لیے ایک استاد کو کن کن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

جواب

اس حوالے سے جہاں تک تجربے اور آگے نفع پہنچانے کی بات ہے تو ایک انسان اگر عالم ہو، نیکی وتقوی اور محنت کا مزاج اس کے اندر باقی ہو، جو اس کام کو کرنے کے لیے اولین شرائط میں سے ہے، نیز اس کے اندر محنت کا مزاج بھی باقی ہو، کیونکہ حفظ کے اندر بہت زیادہ محنت ہوتی ہے اور جب وہ اس رابطے سے کٹ کر درسِ نظامی میں جاتا ہے تو بسا اوقات محنت کا مزاج اس کے اندر سے ختم ہو جاتا ہے، لیکن اگر ایک آدمی عالم ہو اور محنت کا مزاج بھی اس کے اندر باقی ہو اور وہ جم کر درسگاہ میں بیٹھ جائے تو ایسا متقی، محنتی عالم دین اگر مدرس قرآن ہو تو اس جیسا مدرس کوئی اور بن ہی نہیں سکتا! کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے جو بھی ساتھی عالم بن کر حفظ کے مُدرس بنے ان کے کام کی ترتیب ہی کچھ اور تھی۔ان کے کام کی قبولیت، رونق اور برکت ہی اور تھی۔

دوسری جانب جو حضرات صرف حافظ تھے اور حفظ کی درسگاہ کے مدرس بنے، اگرچہ انہوں نے بھی بہت زیادہ اچھا کام کیا، تاہم ان سے وہ منافع سامنے نہیں آئے، کیونکہ حفظ کا کام بہت زیادہ جان توڑ ہوتا ہے۔اور آج کے عالم اس کام سے اسی وجہ سے کتراتے ہیں، جبکہ عمومی طور پر علماء کی ذمہ داریاں نسبتاً آسان ہیں، کیونکہ جمعہ میں جا کر ایک خطبہ دے دینا یا کہیں کوئی بیان دینا ہو تو تیاری کر کے ایک لیکچر دینا اور پوری کلاس کو ایک ہی سبق پڑھا دینا آسان ہوتا ہے۔اس کے بعد کتاب کا اجتماعی سبق پڑھنے والوں کا نتیجہ مختلف بھی آ جائے تو استاد کی کمی شمار نہیں کی جاتی، جبکہ حفظ کے لیے تو ہر طالب علم ایک مستقل کلاس ہے۔ ہر بچے کا علیحدہ علیحدہ سبق سنا جائے گا اور اگر یاد نہیں ہوگا تو بعد میں یاد کر کے وہ طالب علم سنا دے گا، نیز اس کام کو کرنے کے لیے نہایت مضبوطی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں جب دستار بندی ہوتی ہے تو اس میں تمام بچوں کے والدین بھی جمع ہوتے

ہیں، اس تقریب میں ہم خاص طور پر والدین کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ اب ہم آپ کو آپ کے بچے اس حالت میں واپس کر رہے ہیں کہ اگر آپ ان سے دو یا پانچ سپارے بھی سن لیں تو یہ آپ کو آسانی سے سنا دیں گے۔ وضع وقطع کے لحاظ سے بھی اب یہ آپ کے سامنے ہے تو اب یہ آپ والدین کی ذمہ داری ہے کہ ان کو لے کر اور سنبھال کر چلیں۔ اس لیے علمائے کرام اور شعبہ حفظ کے اساتذہ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دوران درس جس طرح طلباء کو تقریر و تحریر بہتر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، عملی مشق کرواتے ہیں یا امامت و خطابت کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں، تبلیغ و تدریس کی اہمیت و فضیلت بتاتے ہیں۔

اسی طرح وہ حفاظ طلباء کرام کو حفظ میں پڑھانے کی ترغیب بھی دیں، فضیلت بھی بتائیں، خیر کم من تعلم القرآن و علمه کا مصداق بننے کی اہمیت اجاگر کریں، بلکہ جامعات کے منتظمین کو بھی چاہیے کہ دورہ حدیث کے فراغت والے سال حافظ علماء کرام کو الگ بلا کر انہیں ترغیب دیں اور ان کی تربیت بھی کریں اور تاکید کریں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر یا مناسب جگہ پر قرآن پاک پڑھانے کو ترجیح دیں۔ چاہے حفظ پڑھائیں یا ناظرہ، اسی طرح یہ حضرات ائمہ مساجد کو بھی تاکید کریں کہ وہ امامت و خطابت اور درس قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ اپنی مسجد میں خود بڑوں اور چھوٹوں کے استاد بھی ہوں۔

تراویح کا سدابہار معمول

سوال

حضرت! کیا آپ اس پیرانہ سالی میں بھی رمضان المبارک کی تراویح میں قرآن پاک سنانے کا معمول جاری رکھے ہوئے ہیں؟

جواب

الحمد للہ! میں باغ والی مسجد میں تراویح سناتا رہا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے عثمان غنی کو یہ ذمہ داری منتقل کر دی تھی جو کچھ سال پہلے شہید ہو گئے ہیں۔ (رفع الله درجاته في عليين) اب میں کمرے میں سناتا ہوں، پیچھے علماء و طلباء کی جماعت ہوتی

ہے۔ یومیہ پانچ پارے سناتا ہوں۔ یومیہ سنتوں اور نفلوں میں ایک پارہ پڑھنے کا میرا معمول ہے لاّ قلیل کبھی رہ جائے۔ وہ بھی سخت عذر کی وجہ سے، لیکن وہ بھی دوسرے دن پورا کر لیتا ہوں۔ اگر کسی دن آدھا پڑھا جائے تو دوسرے دن ڈیڑھ پڑھتا ہوں اور اگر کسی دن نہ پڑھ سکوں تو اگلے دن دو پارے پڑھتا ہوں۔ باقی چلتے پھرتے بھی تلاوت جاری رہتی ہے۔ الحمدللہ!

سوال

حضرت! ہم نے ''اکابر کا رمضان'' نامی کتاب میں پڑھا تھا کہ ہمارے اکابر کثرت سے تلاوت کرتے تھے، میں نے یہ سنا ہے کہ آپ بھی اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باغ والی مسجد، ماڈل ٹاون، اپنے مقام سے قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں اور اسی طرح تلاوت کرتے ہوئے جامعہ دار القرآن، مسلم ٹاؤن پہنچ جاتے ہیں؟

جواب

یومیہ سنتوں اور نفلوں میں ایک پارہ پڑھنے کا میرا معمول ہے لاّ قلیل کبھی رہ جائے۔ وہ بھی سخت عذر کی وجہ سے، لیکن وہ بھی دوسرے دن پورا کر لیتا ہوں۔ اگر کسی دن آدھا پڑھا جائے تو دوسرے دن ڈیڑھ پڑھتا ہوں اور اگر کسی دن نہ پڑھ سکوں تو اگلے دن دو پارے پڑھتا ہوں۔ باقی چلتے پھرتے بھی تلاوت جاری رہتی ہے۔ الحمدللہ!

طلبہ کی حفظان صحت پر توجہ

سوال

حضرت! خاص طور پر حفظ کے طلباء اور اساتذہ کرام صبح فجر سے لے کر عشاء تک پڑھتے پڑھاتے ہیں، بیٹھ بیٹھ کر ان کی صحت خراب ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ ان کے لیے ورزش کا بھی کوئی نظام ہے؟

جواب

بچوں کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ہم انہیں ترغیب دیتے ہیں کہ وہ روزانہ

کھیل یا ورزش کریں۔اس کے لیے ان کو وقت بھی دیتے ہیں۔ان کا تعلیمی وقت نمازِ فجر کے ایک گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے،اس میں ترغیب ہوتی ہے سیر کریں،عصر سے مغرب تک بھی وقفہ ہوتا ہے۔اس وقت میں پڑھائی نہیں ہوتی۔ وہ چاہیں تو سیر کریں، گراؤنڈ میں چلے جائیں،سیر وتفریح کے لیے موسم کے مطابق جب گرمی کا موسم ہوتا ہے رات چھوٹی ہوتی ہے،کبھی مچھر بھی ہوتے ہیں نیند پوری نہیں ہوتی۔تو ہم نماز فجر کے بعد انہیں سلا دیتے ہیں،وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ سو جائیں۔صبح ہشاش بشاش ہوتے ہیں۔صحیح طریقے سے سارا دن تعلیم میں مصروف رہتے ہیں،لیکن سردی میں یہ ہوتا ہے کہ لازمی باہر نکلیں اور سیر کریں۔ورزش کرنا میرا معمول رہا ہے،لیکن اب ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف کی وجہ سے نماز بھی عذر والی پڑھتا ہوں۔نماز شروع تو کھڑے ہو کر کرتا ہوں اور ختم بیٹھ کر کرتا ہوں۔اسی وجہ سے الحمد للہ! تراویح میں ختم قرآن کی ہمت اور توفیق ابھی تک چلی آ رہی ہے۔

عصری تعلیم کا ضابطہ

سوال

حضرت! آپ کے ہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی عصری تعلیم کا کوئی نظام بھی ہے؟

جواب

ہمارے ادارے میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، بلکہ ابتدائی عصری تعلیم کے لیے تو باقاعدہ اساتذہ اور بورڈ کے امتحان کا انتظام کیا جاتا ہے۔اس کے بعد بڑے درجات میں بھی عصری تعلیم جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔اس وقت ہمارے شعبہ اسکول میں چار پانچ سو طلباء ہیں۔جن بچوں نے دو تین کلاسیں پڑھی ہوتی ہیں انہیں تین سال میں ہم میٹرک کرا دیتے ہیں۔اگر کسی نے پہلے سے اسکول نہیں پڑھا ہوتا تو اس کو چار سال لگ جاتے ہیں، نیز میٹرک بھی سائنس کے مضامین میں کراتے

ہیں۔ باقاعدہ بورڈ کا امتحان دلوایا جاتا ہے۔ اب تک اس شعبے سے پانچ سو بچے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس شعبے میں کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ان کا قیام وطعام، رہائش اور علاج معالجہ سب فری ہے، ان کا رزلٹ بھی اوسطاً سو فیصد نتائج ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ 95 یا 98 فیصد نتائج بھی ہوتے ہیں۔ شروع میں ہم نے کچھ معلمین باہر کے رکھے تھے، اب ہمارے پاس سے جو طلباء عالم بن کر فارغ ہوئے ہیں۔ میٹرک وغیرہ بھی انہوں نے ہمارے پاس سے کی ہوئی ہے۔ انہی میں سے کچھ بچوں نے میٹرک کرنے کے بعد دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دورہ حدیث تک اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ بی اے بھی پاس کر لیا۔ اب ہم نے اس شعبہ میں انہی حضرات کو بطور استاد تدریسی ذمہ داری دی ہے۔ انہوں نے ہمارا میٹرک کا یہ شعبہ سنبھال رکھا ہے۔

سوال

حضرت! ایک طالب علم، جب عالم دین بھی بن جائے اور بی اے/ایم اے بھی کر لے تو وہ درجہ حفظ تو نہیں پڑھا سکتا؟

جواب

کیوں نہیں! وہ پڑھا سکتا ہے اور پڑھاتا بھی ہے، بلکہ وہ بہترین مدرس بن کر بہت اچھا پڑھاتا ہے۔

سوال

حضرت! وہ کیسے پڑھائے گا؟ کیونکہ وہ کہے گا کہ میں عالم فاضل ہوں، پڑھا لکھا ہوں، اب بچوں کو پڑھانے کیسے بیٹھ جاؤں؟ دوسرے الفاظ میں آپ کے پاس کون سا الٰہ دین کا چراغ ہے، جس سے علمائے دین قاری صاحبان آپ کو میسر آ جاتے ہیں؟

جواب

حضرت! یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں (آپ نے قریب بیٹھے باغ والی مسجد کے انتہائی جید اور قابل، قدیم استاد جناب قاری زاہد الیاس صاحب کی طرف اشارہ کیا) یہ حافظ ہمارے

پاس بنا ہے۔ درجہ رابعہ تک ہمارے پاس پڑھا ہے (کیونکہ اس وقت نظام ہی درجہ رابعہ تک تھا) پھر ہم نے اس کو جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد بھیج دیا۔ اب 21 سال ہو گئے ہیں۔ یہ مستقلاً یہاں پڑھا رہے ہیں درجہ حفظ میں، یہ مثال ہے آپ کے سامنے۔

میرے مدرسین، میرے بیٹے

سوال

ماشاءاللہ حضرت! لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ میں کئی مدرسوں میں گیا وہاں مجھے ایک طرف ایسی کوئی اپنائیت اور محبت نظر نہیں آئی تو دوسری جانب اتنے باصلاحیت لوگ شعبہ حفظ کے مدرسین کے طور پر نظر نہیں آتے۔ وہ مدرسین سادہ قاری ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ مار پیٹ کا کلچر بھی اپنائے ہوئے ہوتے ہیں، جس سے نئی نسل کے لوگ خاصا متنفر بھی ہوتے ہیں۔

جواب

ہمارے ادارے میں جو اساتذہ کرام کام کر رہے ہیں، میرا سلوک ان کے ساتھ ان کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ میں نے ان کے سامنے اپنے آپ کو کبھی مہتمم بنا کر پیش نہیں کیا۔ ان حضرات نے بھی کبھی مجھے مہتمم نہیں سمجھا۔ یہ مجھے اپنا والد سمجھتے ہیں، میں ان کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ خوشی یا غمی کے مواقع پر ہم اپنے مدرسین کے ساتھ خصوصی تعاون کرتے ہیں۔ مدرسے کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں لیکن ہم ضابطے سے ہٹ کر بھی ان سے تعاون کرتے ہیں۔ ہمارے مدرسے کے ایک سینئر استاذ محترم کو ایک مرتبہ ٹی بی کی شکایت ہوئی۔ ان کا طلباء کے ساتھ رہنا بھی منع تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ برائے مہربانی ان کو تدریس کے شعبے سے الگ کر دیں۔ ہم نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی مدرسے میں کھپا دی ہے، ہم ایسا نہیں کر سکتے، ہم ان کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔ ہم نے ان سے کہا آپ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نو ماہ آرام

کریں۔ مدرسہ کی طرف سے آپ کو چھٹی ہے، تنخواہ بھی ملے گی، جو مکان آپ کو ملا ہے آپ اس میں ہی رہیں گے اور ادویات بھی ہمارے ذمے ہے۔ ڈاکٹر جو خوراک آپ کو بتائے گا وہ بھی ہمارے ذمے ہے۔ دودھ گوشت مکھن وغیرہ ہم فراہم کریں گے۔ آپ یکسو ہو کر گھر میں آرام کریں۔ جب ڈاکٹر آپ کو کلیئر کر دے تو آپ اپنی سیٹ پر واپس آجائیں اور تدریس کریں۔ ایسے تین چار اساتذہ کے کیس ہمارے پاس ہیں، وہ بیمار ہوئے، پھر ٹھیک ہو کر پڑھا رہے ہیں۔

اسی طرح جب کسی کے ہاں ڈلیوری کیس کا مسئلہ ہوتا ہے تو ہم نے ان کے لیے خرچہ مقرر کیا ہوا ہے، جن کا نارمل کیس ہوتا ہے ان کے لیے آج کل کے لحاظ سے پانچ ہزار، اگر آپریشن سے ہو تو چالیس سے پچاس ہزار تک ہم مدرسے کی طرف سے اساتذہ کو رقم دیتے ہیں، کچھ مدرسے کی رقم سے اور کچھ معاونین کے ذمے لگا دیتے ہیں۔ گھر کے مسائل ہوں تو اس میں تعاون کرتے ہیں، کھانا بھی مدرسہ کی طرف سے، کسی کے دس بچے بھی ہوں تو بھی کھانا مدرسہ کی طرف سے دیا جاتا ہے، اس پر گیس بجلی کا کوئی چارج نہیں۔ ہمارے بعض استادوں نے اے سی بھی لگائے ہوئے ہیں مگر ہم نے ان سے بھی کسی بل کا مطالبہ نہیں کیا کہ کہیں وہ پریشان نہ ہوں۔ اس طرح ہمارے اساتذہ اس ادارے کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ہم سب ایک خاندان کی طرح بخوشی یہاں کام کرتے ہیں۔ حتی الامکان ہمارے معلمین وملازمین یہیں کام جاری رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سوال

اس کا مطلب ہے کہ جس طرح گھر میں بڑا بچوں کا خیال رکھتا ہے، آپ نے بھی ایسے ہی خیال رکھا ہوا ہے۔ ظاہری بات ہے تبھی چھوٹا بھی بڑے کا خیال رکھے گا۔ جب استاد شاگرد کو اولاد کی طرح اور شاگرد استاد کو والد کی طرح سمجھے گا تو کوئی کیوں چھوڑ کر جائے گا...... گویا یہ اصل راز ہے کامیابی کا۔

جواب

ایک دفعہ میں مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے پاس حاضر ہوا، انہوں نے پوچھا کتنی تعداد

ہے؟ اساتذہ کے لیے کیا سہولیات ہیں؟ جب میں نے یہ ساری چیزیں بتائیں تو حضرت بہت خوش ہوئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ایک اور مدرس کی گنجائش ہے؟ گویا حضرت نے اپنی طرف اشارہ فرمایا کہ ''پھر تو میں بھی وہیں آجاتا ہوں۔''

بچوں کو نرمی سے پڑھانے کی اہمیت

سوال

حضرت! مدرسے کے بچے یا تو شوق سے پڑھتے ہیں یا خوف سے، شوق تو بچوں کو کم ہوتا ہے۔ خوف آپ کیسے دلاتے ہیں۔ مار پیٹ ہوتی ہے یا کسی اور طریقے سے؟ اس سلسلے میں آپ کی حکمت عملی کیا ہے؟

جواب

مار پٹائی والا کام تو ترک ہونا چاہیے، ہمارے ہاں بھی اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کے لیے کچھ ترغیب دیتے ہیں، کچھ ذہن بناتے ہیں۔ ان کے والدین کو بلا کر فکر مند کرتے ہیں، انعام دیتے ہیں۔ ہم زیادہ نمبر والوں کو جس طرح انعام دیتے ہیں، اسی طرح پوری سہ ماہی میں اگر کسی کی ایک غیر حاضری بھی نہیں تو ہم اس پر بھی انہیں انعام دیتے ہیں۔ جب کسی بچے کا ایکسیڈینٹ ہو جاتا ہے تو وہ شوق ظاہر کرتا ہے کہ میں گھر میں بیٹھ کر یاد کرلوں گا مدرسے سے کوئی سننے آجائے، اور جب امتحان کا وقت آتا ہے تو اس کے والدین اس بچے کو گاڑی میں بٹھا کر لے آتے ہیں اور ہم ممتحن کو وہاں بھیج دیتے ہیں کہ گاڑی میں اس کا امتحان لیا جائے۔ ترغیب کی وجہ سے شوق اس حد تک پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا تین چیزیں ترغیب، ترہیب اور والدین کا تعاون۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔

طلبہ سے ادارے کے کاموں میں معاونت لینا

سوال

اس وقت دو نکتۂ نظر چل رہے ہیں۔ ایک یہ کہ طلباء سے ادارے کا ہرگز کوئی کام

نہ لیا جائے، کیونکہ والدین انہیں پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ضروری ہے، اس لیے جب بچے مدرسے اور اساتذہ کی خدمت کریں گے تو ان کی تربیت بھی ہوگی اور جسمانی ورزش بھی۔ جیسے میں کیڈٹ کالج گیا تو وہاں دیکھا کہ بچوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اعلان کروایا جاتا۔ ان سے دوڑ لگوائی جاتی۔ پودے لگوائے جاتے ہیں۔ دوسری بات جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو معاشرے کو اچھے ٹیچر کے ساتھ بہترین منتظم بھی مل جائیں گے۔ اس حوالے سے آپ کس نکتۂ نظر کو بہتر سمجھتے ہیں؟

جواب

ہمارے ہاں بھی طلبہ کو مدرسے کی مختلف خدمات میں جوڑا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدرسے میں جو طالب علم دورہ حدیث کر کے فارغ ہوتا ہے وہ صرف عالم ہی نہیں بلکہ ایک اچھا منتظم بھی ہوتا ہے، کیونکہ کھانا کھلانے کی باری، باورچیوں کے ساتھ کھانا تیار کرنے کی باری۔ یہاں تک کہ دورہ حدیث والے طلباء کی بھی خدمت کی باریاں لگتی ہیں، اس سے معیار تعلیم میں فرق نہیں آتا، بلکہ کوئی طالب علم چاہے تو دورہ حدیث تک ساتھ ساتھ ایم اے بھی کر سکتا ہے۔ البتہ اس کے لیے ہماری کچھ شرائط ہوتی ہیں کہ اگر اتنے فیصد نمبر امتحان میں لے گا تو عصری علوم پڑھنے کی اجازت ہوگی، ورنہ نہیں۔ یہ شرط لگانے سے رزلٹ بھی پورا دیتے ہیں اور عصری علوم بھی جاری رکھتے ہیں۔

سوال

حضرت! یہ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے آپ نے بتایا لیکن ہم نے آپ کے مدرسے میں دیکھا یہاں مدرسے میں چمن بنایا گیا ہے، پھول لگے ہوئے ہیں، کھانا بنانا، تقسیم کرنا، جنریٹر چلانا یہ سب کام طلباء نے سنبھالا ہوا ہے۔ اس کام کے لیے تو پچاس آدمی چاہییں، ہر آدمی کی تنخواہ بالفرض دس ہزار ماہانہ ہو، تو ہر ماہ کے یہ تین لاکھ بنتے ہیں، تین لاکھ تو ماہانہ ہیں سالانہ کتنے بنتے ہوں گے؟ آپ یہ سب کام طلباء سے

کیسے لیتے ہیں؟ کس طرح انہیں تیار کرتے ہیں؟

جواب

ہم انہیں ترغیب دے کر ذہن بناتے ہیں۔ سب سے پہلے اساتذہ کا ذہن بناتے ہیں۔ اساتذہ ہمارے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہیں۔ یہ طلباء کو کھانا کھلاتے وقت نگرانی کرتے ہیں۔ کھانے کی سنتیں سکھاتے ہیں، وغیرہ۔

بیرون ملک بھیجے جانے والے فضلاء کی تربیت

سوال

حضرت! اساتذہ کرام کی تربیت کے لیے بھی کوئی نظام ہے؟ جو یہاں آپ کے پاس نہیں پڑھتے یا باہر ملک کے طلباء یہاں نہیں آسکتے ان کی تربیت کے لیے کوئی نظام ہے؟

جواب

دیگر ممالک میں بھی ہمارے ہاں سے پڑھے ہوئے حضرات نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، وہاں تدریسی خدمت کے لیے یہاں سے اساتذہ کرام بھیجے جاتے ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ دیگر ممالک میں بطور مدرس کے جن کو بھی بھیجیں، وہ عالم دین ہوں، نیز ان کو تربیت کے مراحل سے گزار کر بھیجا جائے۔ اب کچھ عرصے سے یہ ترتیب ہے کہ ایک سال بعد ان ممالک میں ہمارا دورہ ہوتا ہے۔ باہر پڑھانے والوں کے پاس، میں بھی اور میرے گھر والے بھی جا کر ان کے نظم کو دیکھ کر ان کا امتحان خود لے کر آتے ہیں۔ جو تجاویز ہوتی ہیں، وہ ان کو دے کر آتے ہیں۔ جب وہاں پر تعلیمی معیار بنا، پھر اور جگہ سے طلب پیدا ہوئی، اب ہماری آٹھ دس شاخیں ہیں جو وہاں کام کر رہی ہیں، کچھ ہمارے مدرسے سے بھیجے گئے اساتذہ ذمہ داران کام کر رہے ہیں۔

کچھ ملائشیا والے حضرات بھی کام کر رہے ہیں، لیکن ملائشیا والے کہتے ہیں کہ ہم جو ملائشیا والے استاد رکھتے ہیں، قانونی مجبوری ہے۔ اس طرح تھائی لینڈ جس کا نام آتے ہی ایک

تصور ذہن میں آجاتا ہے، وہاں ایک صوبہ "ژالا" ہے، وہاں ایک بہت بڑا تبلیغی مرکز ہے۔ جو یہاں کے ذمہ دار اور امیر شیخ محمود کی بیٹی یہاں سے پڑھ کر گئی ہے۔ ہماری اس فاضلہ کے مدرسے میں نوسو بچیاں ہیں۔ تھائی لینڈ میں وہ بھی ہر سال بلاتے ہیں، امتحان کے لیے ایک تقریب رکھتے ہیں۔ جو بچیاں ان کے پاس پڑھتی ہیں ان کی مائیں جو آسانی سے آسکتی ہیں ان کو جمع کرتے ہیں، بیان ہوتا ہے، ترغیب ہوتی ہے۔ الحمد للہ! یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ بڑا مرکز ہے، ایک ہزار تک طلباء ہیں، یہ ایک ایکڑ کا مرکز ہے، وہ بتا رہے تھے کہ جب رمضان میں تراویح ہوتی ہیں تو وہ سارا مرکز کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح کچھ اور بچیاں بھی پڑھ کر گئی تھیں، جو آگے پڑھا رہی ہیں۔ ان کے پاس بھی تین سو سے زیادہ بچیاں پڑھ رہی ہیں۔ اس طرح بحمد اللہ یہ کام باہر بھی ہو رہا ہے۔ اور میرے اساتذہ کرام کی دعاؤں اور روحانی توجہات کی برکت سے خدمت قرآن کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

طالبات کا مدرسہ کیسے چلائیں؟

سوال

ہم نے آپ کے جامعہ کا وزٹ بھی کیا اور سارا انظام بھی دیکھا۔ اسی طرح آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا قاری جمیل الرحمن صاحب دامت برکاتہم نے بھی سارا نظم ہمیں دکھایا ہے اور واقعتاً سارا انظام دیکھ کر اس کی مضبوطی نظر بھی آتی ہے کہ کیسے ایک ایک چیز کو نہایت ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی حدود مقرر کی گئی ہیں، تاکہ کوئی اس حد سے نہ آگے جائے نہ کوئی پیچھے رہے، نیز پردے کا بھی باقاعدہ نظام موجود ہے۔ وہ یہ بھی بتا رہے تھے کہ آج ڈیڑھ سال کے بعد میں یہاں بنات کے حصے میں داخل ہوا ہوں، وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ آپ کو اس جگہ کا وزٹ کروانا تھا، لیکن وہ بھی مکمل باپردہ انتظام کے ساتھ۔ آپ وضاحت فرمادیں کہ جن جگہوں پر ایسی احتیاط بنات کے مدارس کے لیے نہیں رکھی جاتی، کیا وہاں بنات کے

مدارس، خاص طور پر رہائشی مدارس اور ان کا تعلیمی سلسلہ ہونا چاہیے؟

جواب

کیا بنات کا مدرسہ ہونا چاہیے؟

منتظمین مدارس میں ایک بحث چلتی ہے کہ کیا بنات کے مدارس ہونے چاہئیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ ان کے رہائشی مدارس قائم کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اس حوالے سے جو کچھ ہمارے ذاتی تجربات ہیں، وہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے نکتہ نظر کے مطابق جن جگہوں پر بنات کے مدارس کو چلانے کے لیے کوئی احتیاط نہیں کی جاتی ہے، ان جگہوں پر تو بالکل بھی بنات کے مدارس نہیں ہونے چاہئیں، لیکن جن جگہوں پر اس نظام کو چلانے کے لیے پوری طرح سے احتیاط برتی جاتی ہے۔ باپردہ نظام، بچیوں کو لے کر آنے جانے والوں کا کوئی معقول انتظام ہو تو ایسی جگہوں پر تو لازماً بنات کے مدارس ہونے چاہئیں، کیونکہ طالبات کی تعلیم کے بہت زیادہ فوائد ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ہم تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی یہ ذہن سازی بھی کرتے رہتے ہیں کہ آپ نے پڑھ کر یہ علم آگے بھی پہنچانا ہے۔

جب تک آپ لوگوں کی شادیاں نہیں ہو جاتی ہیں، اس وقت تک اپنے اپنے علاقوں میں اس کام کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ جب شادی ہو جائے تو کوشش کریں کہ جن گھروں میں آپ کی شادی ہو تو وہاں پر بھی بچوں کو پڑھانے کی کوئی ترتیب بنالیں، بجائے ادھر ادھر جا کر کسی اور مدرسے میں پڑھانے کے بہتر یہی ہے کہ اپنے ہی ماحول میں رہ کر اپنے کام کو وسعت دیں۔

الحمدللہ! جو بچیاں یہاں سے فارغ ہو کر گئی ہیں اور ان کا ابھی اپنا کوئی باقاعدہ مدرسہ بھی نہیں بنا ہوا ہے تو انہوں نے اپنے گھروں میں ہی یہ کام شروع کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے پاس پچاس، سو تک پڑھنے والے بچوں اور بچیوں کی تعداد ہو گئی۔ تب خود علاقے والوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا گھر اس کام کے لیے چھوٹا ہے اور اتنی گنجائش نہیں ہے۔ جب پڑھنے والی بچیوں کی تعداد اور بھی زیادہ ہو گئی تو ان کے لیے کوئی مستقل نظام بنانا ہو گا تو کئی بڑے علاقوں میں بہت سے مدرسے اسی طرح سے قائم ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں سے فارغ التحصیل

بچیاں سکردو، گلگت کے پہاڑی اور پسماندہ علاقوں میں قرآن کریم پڑھا رہی ہیں اور ایسی جگہوں پر ہمیں ان بچیوں کی تعلیم کے بہت زیادہ فوائد نظر آرہے ہیں۔

سوال

حضرت! ایک بچی کی تعلیم و تربیت، ایک نسل کی تربیت میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟

جواب

بنات کے مدارس کے فوائد و ثمرات:

جی! ہم نے دیکھا کہ پسماندہ علاقے کی بچیاں یہاں پڑھنے آتی ہیں، جہاں اسکول بھی نہیں ہیں۔ ہم ان کو درس دیتے ہیں اور یہ ذہن دیتے ہیں کہ آپ نے فارغ نہیں رہنا بلکہ شادی سے پہلے گھر میں، شادی کے بعد سسرال والوں سے کچھ شرائط طے کر کے کہ میں نے گھر میں قرآن پڑھانا ہے۔ میرے لیے مدرسے میں یا گھر میں پڑھانے کا انتظام کریں۔ یہ ہم ان کو ذہن دیتے ہیں، بچیاں جب وہاں جاتی ہیں تو ان کے پاس پڑھنے والی پچاس، ساٹھ بچیاں ہوتی ہیں۔ بہت سے پسماندہ علاقوں جیسے بلوچستان، گلگت، کشمیر وغیرہ یعنی جہاں تعلیم کے لیے کوئی بھی نظام نہیں وہاں پر یہ بچیاں پڑھا رہی ہیں۔ گلگت میں فرقِ باطلہ کی بچیوں پر انہوں نے محنت کی، ان بچیوں کو تیار کر کے یہاں بھیجا، انہوں نے یہاں سے عالمہ حافظہ بن کر اپنے علاقوں میں جا کر کام شروع کیا، ان کے پاس بھی سو، ڈیڑھ سو بچیاں پڑھنے والی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے وفاق المدارس العربیہ کا اجلاس تھا۔ اس میں یہ بات زیرِ بحث آئی کہ طالبات کے مقیم مدارس بند کیے جائیں۔ ظاہری بات ہے کہ مدارس میں انسانیت کی بنیاد پر خطائیں ہو جاتی ہیں۔ اب ان سات پانچ کی وجہ سے، سب مدارس کو بند کرنے سے علم اور قرآن کریم کے حوالے سے بہت بڑا خلا پیدا ہو گا۔ ہاں! جس سے غلطی سرزد ہو، ان کو معطل کر دیں، بند کریں یا اصلاح کریں۔ باقی سب مدارس کو بند کرنے کا فیصلہ پورے ملک میں ایک علمی خلا پیدا کرے گا۔ ہمارے صدر وفاق، شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کی شروع سے یہی سوچ تھی، لیکن جب اقامتی مدارسِ بنات کی افادیت اجلاس میں بتائی گئی

تو اصولوں کی پابندی، کڑی نگرانی اور اصلاحی کوششوں کے ساتھ ان کو جاری رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا گیا۔

مدارسِ بنات کی کچھ نزاکتیں:

قاری حنیف جالندھری صاحب کی ہمشیرہ قاری محمد طیب کی اہلیہ جن کا ابھی انتقال ہوا (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) دس سال پہلے وہ یہاں تشریف لائی تھیں، چونکہ وہ بھی بنات کا ایک مدرسہ چلا رہی تھیں، تو انہوں نے ہماری اہلیہ سے جہاں اور سوالات کیے، وہاں ایک اہم سوال یہ بھی کیا کہ جو آپ کے پاس بالغہ بچیاں پڑھتی ہیں، جب ان کے مخصوص ایام ہوتے ہیں تو آپ کیسے ان کو سنبھالتے ہیں؟ ہماری اہلیہ انہیں زبانی کلامی جواب دینے کے بجائے ان کو عملاً دکھانے کے لیے لے گئیں جہاں پر واش روم ہیں۔ وہاں جا کر دکھایا کہ ہمارا نظام یہ ہے۔ جو بچیاں نابالغہ ہیں ان کے لیے واش روم الگ ہیں اور جو بالغہ ہیں ان کے لیے واش روم الگ ہیں، لیکن مخصوص ایام میں ان چیزوں کو سنبھالنے کے لیے اندر ایک پورا نظام بنا ہوا ہے۔ وہاں سے ان کو ان دنوں کی تمام استعمال کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ پھر ان استعمال شدہ چیزوں کو اکٹھا کرنے کا بھی بہت بہترین نظام ہے۔

جب یہ چیزیں اکٹھی کر کے باہر کوڑا اسٹینڈ کی طرف اس طرح لے جاتے ہیں تو الحمد للہ! آج تک کبھی ان پر ہماری نظر بھی نہیں پڑی۔ طالبات کے نظام کا یہ خفیہ گوشہ ہے جس کی طرف عام مدارس والوں کا ذہن ہی نہیں جاتا۔ اگر اس کا انتظام نہ کیا جائے تو سارا مدرسہ گند خانہ بن جائے، کیونکہ جس گھر میں ایک دو بچیاں ہوتی ہیں تو ان کی والدہ سب باتیں سمجھتی ہے کہ کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے؟ کیسے تربیت کرنا ہوتی ہے؟ تو جہاں سیکڑوں طالبات ہوں وہاں پر آپ خود اندازہ لگالیں کس طرح انتظام ہوگا؟ اور اسے کس طرح چلانا ہے؟ بہر حال! اس معاملے میں بچیوں کی تربیت، صفائی اور رازداری کا اہتمام بہت زیادہ ضروری ہے۔

سوال

حضرت! آپ کے یہاں طالبات کی تربیت کا کیا نظام ہے؟

جواب

بچیوں کی تربیت کا کڑا نظم:

ایک ہے علمی تربیت کہ درس گاہ میں کیسے بیٹھنا ہے؟ سبق کیسے یاد کرنا ہے؟ لیکن طالبات کے لیے بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے ان کو حاضری کا پوری طرح پابند کرنا، والدین کے لیے ہر وقت بچیوں کو پابند کرنا مشکل ہوتا ہے اور پھر بعض بچیاں جیسا کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات میں سے بات نکالنا، بہانے بنانا اب یہ چیزیں ان سے نکل جائیں اور والدین بھی اس بات کے پابند ہو جائیں کہ بچیاں بروقت آئیں، بروقت جائیں۔ اس کو کنٹرول کرنے کے لیے ہمارے ہاں یہ نظام ہے کہ جب داخلہ ہوتا ہے تو ہم والدین کو ایک فارم دیتے ہیں، جو انہیں دفتر سے ملتا ہے کہ آپ اس کا مطالعہ کریں، آپ کا داخلہ تین ماہ بعد ہوگا، اس سے پہلے آپ اس فارم کا مطالعہ کریں آپ اس پر عمل کر سکتے ہیں، ان شرائط کی اگر آپ پابندی کر سکتے ہیں تو آپ کی بچی کا داخلہ ہو سکتا ہے، فلاں تاریخ کو تشریف لے آئیں۔ اگر عمل نہیں کر سکتے تو داخلہ مشکل ہے اور ہماری طرف سے معذرت قبول فرمائیں۔

اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ بچی سونے کا زیور نہ پہن سکتی ہے اور نہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے، یونیفارم مدرسے کا پہننا ہوگا، مرد رشتہ دار کی ملاقات نہیں ہو سکتی، چاہے محرم ہو یا غیر محرم۔ پہلے محرم کی ملاقات پر پابندی نہیں تھی لیکن کچھ مسائل کی وجہ سے اب یہ پابندی لگائی گئی ہے، کیونکہ دیہات کی بچیاں ہوتی ہیں ان کے ہاں پردے کا شرعی نظام نہیں ہوتا۔ والدین جب بچیوں سے ملنے آتے تو اپنے ساتھ ایسے رشتہ داروں کو بھی لے کر آتے، جن سے شرعی طور پر بچی کا پردہ لازم تھا۔ اس بنا پر ہم نے محرم اعزہ کی ملاقات پر بھی پابندی لگا دی۔ اب صرف والدہ ملاقات کر سکتی ہے، وہ بھی اس بچی سے جو ایک ماہ سے یہاں مقیم ہو، جو پندرہ دن یا اس سے کم کا قیام کرتی ہیں ان سے ان کی والدہ کی بھی ملاقات نہیں کرائی جاتی۔ ہم داخلے کے وقت والدین سے پوچھ کر لکھ لیتے ہیں کہ یہ بچی ایک ماہ بعد گھر جائے گی، ایک ہفتے بعد جائے گی یا پندرہ دن بعد؟ تو جس بچی کا قیام ایک ماہ کے عرصے سے زیادہ ہوتا ہے تو اس بچی سے

اس کی والدہ مخصوص اوقات مقررہ میں (صرف جمعہ کے دن) ملاقات کرسکتی ہے۔اگر والدہ بھی درمیان ہفتے میں آگئی تو اس کی اپنی بچی سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔اس طرح داخلے کے ساتھ ہی والدین اور بچیوں کی ذہن سازی کردی جاتی ہے۔تعلیمی دورانیہ اچھا گزرجاتا ہے۔

سوال

جب یہ معلمات پڑھانے لگتی ہیں تو ان کی تدریس کے لیے تربیت وغیرہ کا کیا طریقہ کار ہے؟

جواب

پڑھائی کا نظم:

ہمارے ہاں شعبہ بنات میں تقریباً درجہ حفظ میں چھ سو اور درجہ کتب میں آٹھ سو، یعنی کل چودہ سو بچیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔درجہ حفظ میں معلمات ہی پڑھاتی ہیں استاد کوئی نہیں۔یہ سب معلمات یہیں کی فاضلہ ہیں۔ جب یہ معلمات پڑھانے لگتی ہیں تو ان کی تدریس کے لیے تربیت وغیرہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ جونئی فاضلہ بچی ہوتی ہے (پڑھانے والی) اسے تربیت کے لیے ان کے ساتھ بٹھایا جاتا ہے جو پہلے سے پڑھارہی ہیں، تاکہ وہ سمجھ جائے، جب تسلی ہوجاتی ہے کہ اس نے کچھ سمجھ لیا ہے تو ان کو ایک چھوٹی کلاس بنا کے دی جاتی ہے، مثلاً: اگر ہمارے پاس ایک کلاس میں پچیس بچیاں ہیں تو اسے دس بچیاں دی جاتی ہیں پھر ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔جیسے جیسے منتظمین مطمئن ہوتے جاتے ہیں تو کلاس بڑھاتے جاتے ہیں۔ہمارے لیے شعبہ بنات میں مشکل چیز یہ ہوتی ہے کہ ایک تو معلمہ اتنی جلدی تیار نہیں ہوتی، ہم مشکل سے ان کے والدین کو اور بچیوں کو ترغیب دے کر تیار کرتے ہیں۔

اگر کوئی معلمہ تیار ہوتی ہے تو وہ بھی عام طور پر صرف دو سال کے لیے۔اس کے بعد والدین اس کی شادی کے لیے فکر مند ہوجاتے ہیں اور وہ اجازت لے کر چلی جاتی ہے۔اب ہم نے دو سال میں تیار بھی کرنا ہوتا ہے، کام بھی لینا ہوتا ہے، معیار بھی لینا ہوتا ہے، سب سے کٹھن مرحلہ ہمارے لیے بلکہ تمام مدارس کے لیے یہی ہے جس سے تمام مدارس والے پریشان

ہیں، کیونکہ بہت کم ایسی بچیاں ہوتی ہیں جو زیادہ وقت پڑھاتی ہیں۔ اس مجبوری کی وجہ سے ہمیں ہر وقت سات آٹھ نگران معلمہ تیار رکھنا پڑتی ہیں، تاکہ کوئی پریشانی نہ ہو، نظام خراب نہ ہو۔ ایک معلمہ جائے تو اس کی جگہ دوسری معلمہ تیار ہو جو ماحول، مزاج اور طریقہ تدریس کو سمجھتی ہو۔ اس شعبے کے بہت سے مسائل ہمارے سامنے اتنے آئے ہیں کہ بعض اوقات میرا دل چاہتا ہے کہ میں شعبہ طالبات میں مکتب شروع ہی نہ کرتا۔

سوال

جامعہ دارالقران میں طالبات کا نظام وسیع پیمانے پر موجود ہے اور یہ کام نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ بیرون ممالک بھی جاری ہے۔ بنات کے ادارے کو چلانے میں حساسیت بھی بہت زیادہ ہے تو یہ نظام بنانا اور اتنے منظم طریقے سے چلانا کیسے ممکن ہے؟

جواب

جامعہ دارالقرآن کا شعبہ بنات:

بنات کے ادارے کو چلانے میں حساسیت بہت زیادہ ہے۔ یہ بڑا حساس، انتہائی کٹھن اور جان توڑ نظام ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے مولانا عادل خاں شہید رحمہ اللہ (فرزند ارجمند صدر وفاق مولانا سلیم اللہ خانؒ) کا موقف بنات کے نظام کو چلانے میں کافی سخت تھا۔ ایک دفعہ مولانا شہید (چونکہ ان کے سسرال بھی فیصل آباد میں ہیں) وہ اور ان کی اہلیہ یہاں تشریف لائے تو سب سے پہلے مولانا عادل صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی، پھر ہم نے باپردہ نظام کے ساتھ ان کو شعبہ بنات کا وزٹ کروایا۔ خواتین منتظمین نے ان کی اہلیہ کو اس شعبے کا وزٹ کروایا اور اس کا سارا نظام بتایا اور سمجھایا۔

وہ ہمارے بنات کے نظام سے اتنا متاثر ہوئیں کہ جب وہ وزٹ کر کے واپس تشریف لائیں تو ہمارے گھر والوں سے کہنے لگیں کہ اب میں نے بھی واپس جا کر اپنے سسر سے یہ کہنا ہے کہ مجھے بھی طالبات کا مدرسہ بنا کر دیں۔ یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اگر ہم اکیلے اس کام کو کرنا چاہتے تو شاید یہ ہم سے نہ ہو پاتا، مگر ہماری اہلیہ محترمہ نے طالبات کے نظام کو

چلانے کے لیے اتنی جان توڑ کوشش اور محنت کی ہے کہ شاید یہ بات ہمارے تصور سے بھی باہر ہے۔ ان طالبات کے نظام کو چلانے کے ساتھ ساتھ گھر کے ماحول کو بھی بڑے احسن طریقے سے ہم دونوں نے نبھایا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، بلکہ اس کام میں اللہ کی توفیقات ہمارے شامل حال رہیں۔ صرف یہ نہیں تھا کہ مقیم بچیاں ہوں یا شہری بچیاں، وہ مدرسے میں آئیں اور صرف پڑھا اور پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں، بلکہ اس کے علاوہ اندر کے مسائل بھی کافی زیادہ تھے۔

مثلاً: ایک بچی پڑھ رہی ہے اور وہ بلوغت کے قریب پہنچ گئی ہے تو ایسی صورت میں اس کو سنبھالنا پھر ایک دو نہیں بلکہ جہاں سیکڑوں کی تعداد میں بچیاں موجود ہوں وہاں اس نظام کو سنبھالنا، کنٹرول کرنا یہ سب ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے اور اس کام کو کرنا ہمارے تصور سے بھی بالاتر تھا کہ ہم اتنے پیچیدہ نظام کو سنبھال بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے اتنا عرصہ اس ادارے میں گزارا ہے لیکن آج تک طالبات سے متعلق کوئی چیز بھی ہم نے کوڑے دان میں بھی کبھی نہیں دیکھی اور نہ باتھ روم میں پھیلی ہوئی دیکھی ہے، بلکہ ہم نے تو یہاں تک بھی احتیاط رکھی ہے کہ جو چھوٹی بچیاں ہیں ان کے باتھ روم الگ ہیں اور بڑی بچیاں جن کے اس قسم کے مسائل تھے ان کے باتھ روم الگ، تا کہ ایک نظام مکمل طور پر برقرار رہے۔ ایک بار قاری محمد حنیف صاحب (ناظم اعلیٰ: وفاق المدارس العربیہ) کی ہمشیرہ یہاں تشریف لائیں (بورے والا سے ان کا تعلق ہے) ان کا اپنا بھی طالبات کا مدرسہ ہے ان کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے مدرسے کا وزٹ کریں، اصل میں وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ ہم نے خواتین سے متعلقہ مخصوص مسائل کو کس طرح کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

اسی طرح شہری بچیوں کو لانے میں اور لے جانے کے لیے بھی ایک خاص نظام ہم نے بنایا ہوا ہے یعنی ایسا نہیں کہ گھر سے جو بھی آئے، چاہے وہ والد ہو، بھائی ہو، ماموں ہو یا چاچو ہو تو ہم ان کے ساتھ ان کی بچیوں کو روانہ کر دیں بلکہ اس کام کے لیے ہم نے الگ باقاعدہ کارڈ بنائے ہوئے ہیں۔ آنے والے کی طرف سے جب ہمیں وہی کارڈ موصول ہوگا تب ہی ہم بچی

کو اس کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ اسی طرح مقیم بچیوں کے لیے بھی یہی ضابطے اور قوانین ہیں کہ جو بھی ان کو لینے آئے گا تو اگر وہ کارڈ جو ہم نے ان کو دیا ہوا ہے وہ ہمیں موصول ہوگا تو وہ بچی ہم ان کے ساتھ روانہ کریں گے اور کارڈ ہم ان سے لے کر ثبوت کے طور پر سنبھال کے رکھ دیتے ہیں کہ فلاں بندہ اس بچی کو لینے کے لیے آیا تھا پھر جب وہ اس بچی کو چھوڑنے واپس مدرسہ میں آئے گا تب وہ کارڈ اس کو واپس کیا جائے گا۔ اس طرح سے ہم نے بچیوں کے تعلیمی شعبہ کو چلانے کے لیے ایک مضبوط نظام بنایا ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کبھی بھی کوئی اس طرح کا واقعہ یا حادثہ پیش نہیں آیا۔

اس کام کے لیے پہلے تو ہم نے کچھ چھوٹ دے رکھی تھی کہ بچی کا والد ایک ماہ بعد اس سے ملنے آسکتا ہے، اس کے لیے ہم نے ایک علیحدہ مکان بنایا ہوا تھا، جہاں بچیوں کے والدین ان سے ملاقات کرتے تھے، لیکن پھر بعد میں ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ آنے والے شخص کے گاؤں کا اگر کوئی بچہ یہاں پڑھتا ہے تو وہ اس بچے کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہ بات ہمارے لیے پریشان کن تھی کہ کوئی والد آکر دوسروں کے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے اور یہ کہے کہ میرا کزن ہے، رشتہ دار ہے، وغیرہ۔ اس واقعے کے بعد پھر ہم نے مرد رشتہ داروں سے ملاقات پر مکمل طور پر پابندی لگادی۔

ہم نے یہی قانون بنایا کہ صرف بچی کی والدہ کارڈ کے ساتھ آئے اور وہ بھی تعلیمی دنوں کے علاوہ ایک محدود وقت کے لیے اپنی بچی سے ملے، تو اس کے لیے ہم نے جمعہ کا دن مخصوص کیا ہوا ہے۔ وہ بھی ان بچیوں کے لیے جنہوں نے ایک مہینے کے بعد گھر جانا ہوتا ہے۔ جبکہ وہ بچیاں جنہوں نے ایک ہفتہ یا پندرہ دن کے بعد گھر جانا ہوتا ہے، ان کے لیے اس قسم کی ملاقات کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس طرح شعبہ بنات کا یہ نظام بحمد اللہ! بہت مضبوطی کے ساتھ چل رہا ہے اور خدا کرے اسی مضبوطی کے ساتھ یہ نظام ہمیشہ چلتا بھی رہے، آمین۔

حفظ قرآن کی مدتِ تکمیل

سوال

حضرت! آپ نے ساری زندگی قرآن کی خدمت میں لگادی، اور آپ کی اولاد نے بھی اسی خدمت کو مقصد حیات بنایا ہے بلکہ آپ تو اپنے اساتذہ اور حضرت قاری رحیم بخشؒ کے خادم بھی رہے۔ عشاق قرآن کے ہم نے بے شمار واقعات پڑھے تھے، لیکن آج اپنی آنکھوں سے قرآن کریم کے خدام کو اور خدمت قرآن کی برکات کو دیکھ بھی لیا ہے۔ اچھا حضرت! کوئی غیر معمولی واقعہ کسی بچے کے حفظ قرآن کے متعلق ہو تو ارشاد فرمائیں!

جواب

قرآن کریم تو ہے ہی معجزہ، اس کا اعجاز پڑھنے پڑھانے والوں پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، پچھلے سے پچھلے سال، ہمارے شاگرد حافظ ارشد کی دس سالہ بچی نے ساڑھے چار ماہ میں حفظ قرآن مکمل کیا، گردان کی اور امتحان بھی دیا۔ اسی طرح آٹھ ماہ اور گیارہ ماہ کے واقعات بھی ہیں، جیسے ہمارے ڈاکٹر اطہر صاحب کے بیٹے ڈاکٹر مغیث صاحب نے میرے پاس نو ماہ میں حفظ مکمل کیا۔ بعض بچوں میں خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ہم نے تین سال کا وقت عمومی رکھا ہوا ہے۔ کوئی جلدی بھی کر جاتا ہے۔

سلسلہ ”پانی پت“ کی حقیقت اور تاریخ

سوال

قاری صاحب! یہ سلسلہ پانی پت کی حقیقت اور تاریخ کیا ہے، نیز اس طرز تعلیم کی کیا انفرادیت اور خاصیت ہے؟ اور اس کے فوائد آپ کی نظر میں کیا ہیں؟ کیونکہ آپ کا اپنا بھی، آپ کے اسلاف کا سلسلہ بھی وہیں سے ہے۔ ہم نے آپ کے

ادارے جامعہ دارالقرآن میں بھی اسی طرز تعلیم کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب

"پانی پت" ہندوستان کے صوبہ ہریانہ کے ضلع کرنال کے ایک علاقے کا نام ہے۔ جس طرح دارالعلوم ایک مدرسہ ہے اور دیوبند ایک علاقہ ہے۔ جنہوں نے وہاں سے پڑھا ہے وہ دیوبندی کہلائے، اسی طرح سے وہ سلسلے جن کا تعلق پانی پت سے ہے وہ اس نسبت سے مشہور ہیں۔ پانی پت پہلے شرک کا ایک گڑھ تھا اور یہاں تقریباً سات سو ہجری میں مسلمانوں کی آمد آہستہ آہستہ شروع ہوئی۔ ان میں سے جو لوگ باہر سے آئے تھے ان میں اہل عرب بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے، انہوں نے یہاں پر اپنا دینی کام شروع کیا۔ ہمارے بڑے اساتذہ میں سے ایک ہیں حضرت قاری مصلح الدین عباسی رحمہ اللہ، انہوں نے بارہ سو ہجری میں باقاعدہ مدینہ منورہ میں جا کر تجوید کا کورس کیا اور اس وقت مدینہ منورہ کے حرم شریف کے جو امام تھے، ان کا نام شیخ عبید اللہ تھا، قاری مصلح الدین نے وہاں پر ایک سال گزار کر ان سے استفادہ کیا۔

اس کے بعد واپس آ کر انہوں نے اسی طرز پر تعلیم و تدریس کا کام شروع کیا اور یہ خاص طرز تعلیم کوئی مطلوب چیز نہیں ہے، بلکہ اصل چیز جو آپ کو بھی ہر جگہ نظر آئے گی، بڑے بڑے ائمہ اور قراء کی شروحات اور کتب کو اگر ہم دیکھیں تو ان کا زور بھی صرف تجوید پر تھا اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تجوید کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھیں، چاہے لہجہ کوئی بھی ہو۔ اصل مقصد تجوید کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھنا ہے۔ اگر پچاس یا سو سال ہم پیچھے چلے جائیں تو اس وقت کے ائمہ کی طرزیں آج کی طرزوں کی طرح نہیں تھیں۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس پانی پت کے سلسلے میں ہمارا جو بچوں پر محنت کروانے کا مزاج بنا ہوا ہے وہ عام جگہوں پر نہیں ہوتا اور اس سلسلے میں ہمارے بڑے حضرت قاری فتح محمد صاحب کا معیار بہت بلند تھا، وہ فرماتے تھے کہ قرآن مجید کا معیار تو

یہ ہونا چاہیے کہ جب بھی کوئی آپ سے، جہاں سے بھی قرآن مجید سنے، اس میں کوئی غلطی نہ آئے اور یہی ان کا مزاج اور معیار بھی تھا اور ان کے شاگردوں میں بھی پھر یہی چیز منتقل ہوئی اور بڑے بڑے جید حفاظ اور قراء پیدا ہوئے۔

یہی اس طرز کا ایک خاصہ اور اس کا طرہ امتیاز بھی ہے۔ جو بھی اس سلسلے کو آگے لے کر چلے گا تو وہ اسی کے ساتھ منسلک ہوگا۔ ہمارے پانی پتی قراء میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو دوسری طرز میں بھی نہایت شاندار اور بڑے اچھے انداز میں قرآن مجید پڑھتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں کسی پر بھی اس طرح کا کوئی اعتراض اور گرفت نہیں ہے جو جس طرز میں پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے۔

بھولا ہوا قرآن یاد کرنے کا طریقہ

سوال

قاری صاحب! یہ ارشاد فرمائیں کہ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ اپنا قرآن مجید پختہ کیسے رکھا جائے؟ اور رمضان میں تراویح میں قرآن سنانے کے معمول کو کیسے برقرار رکھا جائے؟ اپنے طویل تجربے کی روشنی میں وضاحت فرما دیں! کیونکہ آج کل اکثر و بیشتر حفظ مکمل ہونے کے بعد اس کو محفوظ رکھنا، حفاظ کے لیے بہت مشکل مسئلہ بن چکا ہے۔

جواب

آج کل حفاظ کے لیے اکثر و بیشتر حفظ مکمل ہونے کے بعد اس کو محفوظ رکھنا بہت مشکل مسئلہ بن چکا ہے۔ نئے حفاظ کرام بے توجہی کی وجہ سے چند سالوں میں ہی قرآن کریم کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ بسا اوقات ابھی تک ان کا حفظ پوری طرح پختہ نہیں ہوا ہوتا کہ بچے امتحان دے کر گھر آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی کسی دیگر تعلیم یا کاروباری مصروفیات میں لگ جاتے ہیں۔ ایسے میں قرآن کریم کو کس طرح یاد رکھا جائے؟ اس حوالے سے زیادہ دخل طلباء اور ان کے اساتذہ کے تعلق کا ہوتا ہے۔ جن اساتذہ سے انہوں نے پڑھا ہے اور حفظ کیا ہے، ان

دونوں کا آپس میں رابطہ بہت زیادہ ضروری ہے۔ یہ مسائل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ان دونوں کا آپس میں ربط ٹوٹتا ہے۔ ہم نے شروع سے ہی اپنے مدرسے میں یہ نظام رکھا ہے کہ جو بچے ہمارے مدرسے سے پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں، ان کو ہم کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ جوڑ کر رکھتے ہیں۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کو ہر سال رمضان المبارک سے تین ماہ پہلے (بالخصوص، فیصل آباد کے شہری بچوں کو) بلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کرام اور ہماری ایک تفصیلی نشست ہوتی ہے، جو کہ عصر سے لے کر رات 9 بجے تک چار پانچ گھنٹے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہم ان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ جب آپ پڑھتے تھے اس وقت آپ کی عمر چھوٹی تھی، آپ کو ہماری بعض باتیں ناگوار بھی گزرتی تھیں، لیکن اس کام پر آپ کا دماغ اور محنت کتنی خرچ ہوئی ہے اور اس سب کے ساتھ آپ کے والدین کی کتنی محنت صرف ہوئی ہے؟ اس بات کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں، خاص طور پر شہری بچے جن کے والدین گرمی ہو یا سردی، ان کو چھوڑنے کے لیے آتے ہیں۔

آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ ہر کسی کے پاس سواری کے لیے گاڑی موجود نہیں ہوتی، کوئی سائیکل پر ان کو چھوڑنے آرہا ہوتا ہے، کوئی موٹر سائیکل پر۔ پھر یہ کوئی دو تین دن کی بات نہیں تھی، بلکہ تین چار سال تک (جب تک آپ مکمل حافظِ قرآن نہیں بن گئے اس وقت تک) آپ کے والدین یہ ساری مشقتیں برداشت کرتے رہے۔

اس کے علاوہ صبح اور دوپہر کے لیے انہوں نے آپ کو کھانا پہنچانے کے لیے بھی آنا ہوتا تھا۔ پھر رات کو لینے کے لیے آنا ہوتا تھا، یہ مسلسل مشقت کا سلسلہ تھا، جس کا آپ لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ آپ کے والدین نے آپ کے لیے کتنی مشقتیں برداشت کی ہیں۔ صرف والدین ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی محنت تو اس سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ پورے قرآن پاک کو آپ کے سینے میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے مدرسے کا کروڑوں روپے کا بجٹ بھی خرچ ہوا۔ اب اگر آپ لوگ اس کام کو نہیں سنبھالتے تو یہ

بہت بڑا نقصان ہوگا...... قوم کا بھی، آپ کے والدین کا بھی، اساتذہ کا بھی، مدرسے کا بھی...... آپ بہت بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے اللہ نے آپ کو عقل وشعور اور شعوری عمر بھی عطا فرمائی ہے، لہٰذا آپ تمام لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ اس سرمائے کو محفوظ بنائیں۔

ہماری طرف سے انہیں اس کام کو کرنے کی ترتیب بھی بتائی جاتی ہے اور اس کے بھول جانے پر جو وَبال اور وعیدیں ہیں، وہ سب ان کو بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کام کو انجام دینے سے انہیں جو مَرتبہ اور مقام حاصل ہوگا وہ بھی ان کو بتایا جاتا ہے، یعنی ہر سال باقاعدہ ان تمام چیزوں کو تازہ کیا جاتا ہے، لیکن جب ہم نے پہلی بار اس کام کو شروع کیا تھا تو بہت بڑی تعداد طلباء کی جب ہمارے سامنے آئی، جنہیں دیکھ کر ہمیں بہت زیادہ دکھ ہوا کہ ہم نے ان کو کیا بنا کر بھیجا تھا اور یہ کیا بن کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ العیاذ باللہ! بعض بے چاروں کی داڑھیاں صاف، لباس اور وضع قطع عجیب وغریب۔

خیر! یہ سلسلہ چلتا رہا اور اللہ کا شکر ہے اب طلباء کی بہت بڑی تعداد ہمارے پاس آتی ہے تو ان میں سے تقریباً 80 فیصد بچے اس رابطے کی وجہ سے باشرع ہوگئے ہیں، نیز وہ بچے جو بالکل قرآن پاک کو چھوڑ گئے تھے اور انہوں نے اس سے بالکل لاتعلقی اختیار کرلی تھی، تو ان کی آسانی کے لیے میں نے کہا کہ حافظ نے تو بڑی محنت سے پڑھا ہوتا ہے، تو اس کو بس تھوڑی سی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو سب کچھ یاد ہوجاتا ہے۔

آپ سب ایسا کریں کہ اگر بہت زیادہ مشکل ہے تو آپ سارا قرآن تراویح میں نہ سنائیں۔ مکمل قرآن یا پندرہ پارے نہ سنا سکیں تو آپ ہر روز تراویح میں پارے کا ایک پاؤ تو ضرور سنائیں۔ رمضان المبارک میں دن میں کچھ ٹائم نکالیں اور صرف ایک پاؤ یاد کرلیں۔ پھر گھر کے اندر یا باہر جہاں چند دوست جمع ہوں، ان کو تراویح میں وہی ایک پاؤ سنادیں۔ اس طرح ایک مہینے میں سات سپارے ہوجائیں گے۔ رمضان المبارک کے بعد ان سات سپاروں میں سے ہر روز ایک پارہ بار بار سناتے رہیں، اس طرح وہ پارہ اچھی طرح سے یاد ہو جائے گا۔ پھر اگلے سال ایک پاؤ آگے سے اور ایک پاؤ پیچھے سے (یعنی جو پارے گزشتہ سال

یاد نہیں کر سکا، ان سے) یہ آدھا پارہ تراویح میں سنائیں تو انہوں نے اس کام کو شروع کر دیا لیکن ان میں سے کئی لوگ اگلے سال ہی ہمارے پاس آگئے کہ ہم نے ایک پاؤ سے قرآن پاک کو پڑھنا شروع کیا تھا لیکن اب ہمیں پورا قرآن مجید یاد ہو گیا ہے اور اس طرح سے انہوں نے باقاعدہ تراویح میں پورا قرآن سنانا شروع کر دیا۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے نقوش تو ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور تھوڑے سے رابطے اور محنت کے بعد وہ نقوش دوبارہ ابھر کر سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے سے ایک بہت بڑی تعداد تراویح میں قرآن مجید سنانے کی طرف آگئی۔ اسی طرح میں تمام اساتذہ کرام، حافظ علمائے کرام اور زندگی کے دیگر شعبوں سے منسلک حفاظ قرآن سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی اپنے حفظ والے اساتذہ سے منسلک رہیں یا اپنے قریبی مدرسہ، مسجد اور قاری صاحب سے منسلک رہ کر اپنا قرآن یاد کرنے اور سناتے رہنے کی ترتیب بنائیں اور قرآن کی یہ امانت قبر میں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔

عوام الناس، اساتذہ وطلبہ اور حکمرانوں کے نام پیغام

سوال

حضرت! آپ عوام الناس کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟ بالخصوص وہ اپنا تعلق مسجد، مدارس اور علماء کے ساتھ کیسے جوڑیں؟

جواب

تمام والدین کے دل کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد نیک، فرمانبردار اور خدمت گزار بن جائے، لیکن یہ چیز اسکولوں کے ماحول میں خصوصاً جو آج کل کے سکول ہیں، اس میں نہیں ملتی۔ یہ چیز اپنے بچوں میں مسجد ومدرسہ کے ساتھ جوڑنے میں ملے گی، تو عوام کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو مساجد کے ماحول کے ساتھ جوڑیں، پڑھنے کے لیے وہاں بھیجیں، پڑھائی تو اگرچہ ٹیوشن پڑھانے سے بھی ہو جائے گی، یہ بچہ قرآن پڑھ لے گا لیکن جو نورانی ماحول مساجد کا ہے گھر میں پڑھنے سے وہ نورانیت نہیں ملے گی۔ عوام کو چاہیے کہ خود بھی اور اپنے بچوں کو

مساجد کیساتھ جوڑیں، تاکہ شروع سے ہی ایک اچھے ماحول میں بچے کا ذہن دینی بن جائے اور والدین اور اولاد کی سوچ اور مزاج میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

سوال

حضرت! اساتذہ کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب

ہمارے استاد محترم حضرت قاری رحیم بخش صاحب فرماتے تھے کہ جو استاد راتوں کو اٹھ کر شاگردوں کے لیے دعائیں نہیں کر سکتا، اس کو طلباء کو مارنے اور ڈانٹنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ اس کے علاوہ استاد کی سختی میں بھی شاگرد کی خیر خواہی مقصود ہونی چاہیے۔ اساتذہ میں نمازوں کی سستی، درس گاہوں کے اوقات کا خیال نہ کرنا وغیرہ عملی کوتاہیاں عام ہیں۔ مدرسین کے شعبے میں آج جو برکتیں نظر نہیں آتیں، اس کی بنیادی وجہ ہماری یہی کوتاہیاں ہیں۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ ہمارے مدرسے کو دیکھنے آئے، جب وہ فارغ ہو کر میرے پاس آئے تو یہ سوال کیا کہ حضرت! آپ کا مدرسہ ہمارے سامنے بنا اور اتنی جلدی یہاں تک پہنچ گیا! تو آپ کے مدرسہ کی ترقی کا کیا راز ہے؟ میں نے کہا میرا کوئی کمال نہیں، نہ ہنر ہے، لیکن ایک بات ہے جو میں اپنے اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ میرے زمانہ طالب علمی کے مکمل زمانے میں کبھی بھی اپنے کسی استاد کے بارے میں زبان سے کوئی غلط بات نکالنا تو در کنار، کبھی میرے دل و دماغ میں بھی کسی استاذ کے بارے میں غلط خیال تک نہیں آیا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ساری اسی کی برکت ہے۔

سوال

حضرت! آپ طلباء اور طالبات کے نام کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب

طلبہ کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کے والدین نے اس گئے گزرے دور میں ان

کو دنیا کے منافع کمانے میں نہیں لگایا، بلکہ انہیں مدرسہ میں بھیج کر دینی تعلیم کے لیے وقف کیا ہے۔خود ان کے لیے کما کر ان کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔حالانکہ ہر والد کی خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد مالی تعاون میں میرا ہاتھ بٹائے۔ان والدین کا بڑا احسان ہے جو بچوں کے تمام اخراجات برداشت کر کے انہیں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ان پر وہ بچے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں، پھر ایسے بچے جو مدرسے میں رہ کر گھر والوں سے خرچ لے کر پڑھائی پر محنت نہیں کرتے بس وقت ضائع کرتے ہیں، ان کے لیے ایسا کرنا، والدین کی بھی ناشکری ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی ناشکری ہے۔آج کل طالب علموں کا موبائل میں لگ جانا، تعلیم سے بہت بڑی محرومی کی بنیاد ہے، اس سے بچنا چاہیے، لیکن یہ موبائل کی بیماری ایسی نشہ آور ہے کہ طلباء کو سمجھانے، ترغیب دینے کے باوجود بھی وہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

اس موبائل کی لعنت نے ذہنی طور پر بچوں کو اتنا مفلوج کر دیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔اس سے پہلے اخبار، ناول، ڈائجسٹ ہوتے تھے، اس میں اس قسم کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں، لیکن اس بیماری میں تو سب عملاً مبتلا ہیں۔اس میں فحش قسم کی چیزیں سامنے آرہی ہیں۔ انسان کمزور ہے، ان چیزوں کی طرف جلدی بہہ جاتا ہے۔اس صورت میں اگرچہ وہ مدرسے میں پڑھ رہا ہے مگر پھر بھی اس کا ذہن منتشر ہے، جس سے ذہن پڑھائی کی طرف نہیں جاتا، استاد محنت کرتے ہیں لیکن ان کی ساری محنت رائیگاں جارہی ہے۔استاد اور طلباء کو چاہیے کہ موبائل کو ضرورت کی حد تک استعمال کریں۔

میں اساتذہ سے بھی کہوں گا کہ اس لعنت سے بچیں۔ یہ چیز درس گاہوں کے لئے مضر ثابت ہورہی ہے۔بعض اساتذہ ایسے ہیں جن کی خلوت اور تنہائی اچھی نہیں ہے۔وہ رات کو زیادہ دیر تک موبائل میں مصروف رہتے ہیں۔ایسا استاد درس گاہ میں بیٹھ کر کیسے پڑھائے گا؟ اسی طرح بہت سے استاد ایسے بھی ہیں جو اپنی درس گاہ میں بیٹھ کر اس میں مصروف ہوتے ہیں۔انہیں چاہیے کہ ایسا نہ کریں۔ان حالات میں اگرچہ بظاہر تعلیم تو ہورہی ہے، مگر اس تعلیم کی جو روح ہے، وہ اس سے نکل جاتی ہے اور تعلیم کی ترقی اور روحانیت ختم ہو جاتی ہے۔اللہ

تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھیا ور ہماری خلوت وجلوت کو صالحین کے موافق بنائے۔

سوال

حضرت! حکمرانوں کے لیے کوئی پیغام؟

جواب

حکمران بھی ہمارے ہیں، نیک صالح مسلم حکمران کو عوام کے لیے اللہ کا سایہ کہا گیا ہے۔ہمیں جائز امور میں ان کی اطاعت اور ان کے لیے دعا کا حکم ہے۔ہم حکمرانوں کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلائے اور ان کو عدل وانصاف کے ساتھ ملک وقوم کی خدمت کرنے کی توفیق دے اور انہیں اس ملک کی اساس ،کلمہ طیبہ کے لیے محنت کرنے کی توفیق عطا فرمائے ،آمین۔

السند المتصل

الشيخ القارى محمد ياسين حفظه الله ورعاه

عن الشيخ القارى رحيم بخشؒ، عن الشيخ القارى فتح محمدؒ، عن الشيخ القارى محى الاسلام العثمانیؒ، عن الشيخ القارى عبدالرحمن الأعمىؒ، عن الشيخ القارى عبدالرحمن المحدث بن القارى محمدى و الشيخ القارى نجيب الله والشيخ القارى كبيرالدين، عن الشيخ القارى امام الدين الأمروهیؒ، عن الشيخ القارى محمدنِ المعروف كرم الله الدهلویؒ، عن الشيخ القارى قادر بخش و الشيخ القارى محمدیؒ، عن الشيخ القارى الشاه عبد المجيد الدهلویؒ، عن الشيخ القارى غلام مصطفیٰ التهانيسرى ثم الدهلویؒ، عن الشيخ القارى غلام محمدنِ الدهلویؒ، عن الشيخ القارى عبد الغفور الدهلویؒ، عن الشيخ القارى عبد الخالق المنوفیؒ، عن الشيخ القارى شمس الدين الاعمىؒ، عن الشيخ القارى عبدالرحمنؒ، عن الشيخ شحاذه اليمنى والشيخ الشهاب احمد السنباطیؒ، عن الشيخ ابى نصر الطبلاوى والشيخ الجمال يوسفؒ، عن الشيخ القاضى زكريا الأنصاریؒ، عن الشيخ رضوان الدين أبى نعيم والشيخ برهان الدين القلقيلیؒ، عن الشيخ المحقق شمس الدين ابى الخير محمدنِ الجزریؒ، عن الشيخ محمد عبدالرحمن البغدادیؒ، عن الشيخ أبى عبدالله محمد نِ الصائغؒ، عن الشيخ أبى الكمال الضرير وصهر الشاطبى، عن الشيخ ولیّ الله أبى محمد نِ القاسم الشاطبیؒ، عن الشيخ أبى الحسن علیّ ابن هذيلؒ، عن الشيخ أبى داوٗد سليمان بن نجاح، عن الشيخ أبى عمر و عثمان بن سعيد الدّانى، عن الشيخ أبى الحسن طاهر بن غلبونؒ، عن الشيخ أبى الحسن علیّ بن محمد نِ الهاشمى الأعمى، عن الشيخ أبى العباس أحمد الأشنانیؒ، عن الشيخ أبى محمد عبيدالله ابن الصباحؒ، عن الشيخ سيدالطائفة أبى عمروحفص نِ الكوفیؒ، عن الشيخ الامام عاصم نِ الكوفیؒ، عن الشيخ زرّ بن حبيش والشيخ عبدالله بن حبيب والشيخ سعد بن الياس، عن سيدنا عثمان وسيدنا على و سيدنا عبدالله بن مسعود و سيدنا أبیّ بن كعب وسيدنا زيد ثابت رضى الله عنهم، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن جبريل عليه السلام، عن الحق سبحانهٗ و تعالى.

تعلیمی رپورٹ

تدریسِ قرآن میں بہتری، تحفیظ کی پختگی اور تربیت کی ہمہ گیری کے لیے حضرت اقدس حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم نے متنوع تعلیمی خصوصیات کے حامل، ''تعلیمی رپورٹ'' کے نام سے 24 صفحات کا ایک ''احتساب نامہ'' تیار فرمایا تھا۔ جو سالہا سال سے حضرت والا قاری صاحب کے زیرِ نگرانی حفظ کی تمام تعلیم گاہوں میں نصاب اور نظام کا لازمی حصہ ہے۔ اس تعلیمی رپورٹ کے اندراج کا عمل طالب علم کے داخلے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں اس کے بنیادی کوائف کے علاوہ جامعہ کے ساتھ اس کا معاہدہ نامہ، نیز اجتماعی و انفرادی تعطیلات کا حساب درج کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں دو عدد نقشے بنائے گئے ہیں، جن میں حفظ اور گردان میں ہر ہر پارے کے الگ الگ امتحان کا نتیجہ درج ہوتا ہے۔ طالب علم جب تک ایک پارے میں پاس نہ ہو جائے اگلا پارہ شروع نہیں کر سکتا۔ پھر سال بھر میں تین امتحان کے نتائج کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طالب علم کے اخلاق، تربیت اور نمایاں تعلیمی کارکردگی کے حوالے سے متعلقہ استاد محترم کی رائے لکھوا کر والدین کے دستخط لیے جاتے ہیں۔ تعلیم، تربیت، احتساب اور ترقی کے عمل کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے یہ ایک نادر چیز ہے۔ مدرسین ضرور اس سے استفادہ فرمائیں۔

اگلے صفحے پر تعلیمی رپورٹ کے ٹائٹل کا عکس دیا گیا ہے۔ تعلیمی رپورٹ کا نیا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ہمراہ چھپ چکا ہے۔ ادارہ جات و مدرسین کے استفادے کے لیے عام دستیاب ہے۔ حاصل کرنے کے لیے جامعہ دارالقرآن، فیصل آباد کے دفتر تعلیمات سے رجوع فرمائیں۔

(0313-7061617 / 041-2616211)

نام طالب علم ________ درجہ ________ تعلیمی رپورٹ ________

صاحب کتاب

نام: حضرت مولانا قاری محمد یاسین مدظلہم العالی

فاضل درس نظامی: جامعہ خیر المدارس، ملتان

شاگرد خاص و داماد: حضرت مولانا قاری رحیم بخش پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

بیعت و خلافت

مفتی اعظم مفتی عبدالستار رحمۃ اللہ علیہ

قطب الاقطاب حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ الاساتذہ، شیخ الحدیث، حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

مناصب

بانی و مہتمم: جامعہ دار القرآن، مسلم ٹاؤن و جامعہ ضیاء القرآن ماڈل ٹاؤن، فیصل آباد

رکن: مجلس عاملہ وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

رکن شوریٰ، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خدمت قرآن

نصف صدی سے زائد عرصے پر مشتمل تحفیظ القرآن کی تدریس

2 مرکزی جامعات کے مدیر اعلیٰ اور 12 سے زائد ملک و بیرون ملک مدارس کے سرپرست اعلیٰ

اس کتاب میں

- مدرس قرآن کی قدم بہ قدم پیشہ ورانہ رہنمائی
- ابتدائی قاعدے سے فارغ التحصیل کرنے تک آپ حفظ کی تدریس کیسے کریں؟
- دوران تدریس پیش آنے والی مشکلات کا حل
- اساتذہ فن، اکابر قرائے کرام کے خصوصی واقعات، ذاتی مشاہدات کی روشنی میں
- مجدد القراآت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی زندگی کے احوال
- مدرس قرآن کے اوصاف اور قابل اصلاح امور کی نشاندہی
- اپنے طلبہ کی تربیت کیسے کریں؟
- حضرت قاری صاحب کے نصف صدی پر محیط تجربات کا نچوڑ
- مربیانہ انداز گفتگو، مصلحانہ رہنمائی، مجددانہ شان کے ساتھ
- اصلاح مدرسین پر مبنی، اپنے موضوع پر پہلی بار ایک جامع مجموعہ
- مدرسین قرآن، مہتمم حضرات اور ناظمین مکاتب قرآنیہ کے لیے نایاب تحفہ